[illegible]

فتاوی عثمانی

جلد سوم

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ترتیب وتخریج

مولانا محمد زبیر حق نواز

مکتبہ معارف القرآن کراچی

پینتالیس سالہ خود نوشتہ فتاوی کا مجموعہ

فتاوی عثمانی

جلد سوم

کتاب الشرکۃ والمضاربۃ کتاب البیوع کتاب الربا والقمار والتأمین کتاب الاجارۃ کتاب الرہن کتاب الھبۃ
کتاب الودیعۃ والعاریۃ کتاب للقطہ کتاب الغصب والضمان کتاب الجہاد کتاب الامارۃ والسیاسۃ
کتاب الدعوی والشہادات والقضاء کتاب الحدود کتاب الجنایات کتاب الصلح کتاب الوکالۃ کتاب القسمۃ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ترتیب وتخریج

مولانا محمد زبیر حق نواز

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی

(Quranic Studies Publishers)

باہتمام : محمد مشتاق قاسمی
طبع جدید : رجب ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010ء
مطبع : احمد برادرز پرنٹرز، کراچی۔
ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
فون : (021) 35031565,35031566
ویب سائٹ : www.onlineshariah.com
www.quranicpublishers.com
ای میل : info@quranicpublishers.com

ملنے کے پتے:

- مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
فون: 35031565,35031566

- ادارۃ المعارف کراچی
فون: 35049733,35032020

اِجمالی فہرست

فہرستِ موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد سوم

صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر
کیا شرکت یا مضاربت میں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس لی جاسکتی ہے؟ (الائنس موٹرز کمپنی میں جمع کرائی ہوئی رقم واپس لوٹانے کی شرط کا حکم)	۴۷
والد کی طرف سے شروع کرائے ہوئے کاروبار میں والد کو بیٹوں کے حصے مقرّر کرنے اور ان میں کمی بیشی کا اِختیار ہے	۴۹
شرکت میں فریقین کے لئے علیحدہ علیحدہ مال متعین کرکے اس پر نفع نقصان حاصل کرنے کی مخصوص صورت کا حکم	۵۲
مضاربت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے پر ہوگا، جبکہ شرکت (پارٹنرشپ) میں ہر فریق کو اپنے سرمائے کے بقدر نقصان برداشت کرنا ہوگا	۵۳
مضارب کا مضاربت کے اِختتام پر مالِ مضاربت کو قیمتِ اسمیہ پر خریدنے کی شرط کا حکم	۵۵
شرکتِ متناقصہ میں بینک کو قیمت کی ادائیگی سے قبل قلبِ دَین کی ایک مخصوص صورت کا حکم (اسلامی بینک بنگلہ دیش کے ایک سوال کا جواب)	۵۶
(میاں فارم ٹرانسوال افریقہ کی ایک فیملی شراکتی کمپنی سے متعلق مختلف سوالات کے جوابات)	
(ایک معاہدۂ شرکت کی حیثیت)	
۱:- والد کی طرف سے اپنی تجارت و جائیداد چار بیٹوں کو مشترکہ طور پر فروخت کرنے کے ایک معاہدۂ شرکت کا حکم	۵۷
۲:- معاہدۂ شرکت کی خلاف ورزی کرنے والے شریک کا حکم	۵۷
۳:- معاہدۂ شرکت میں سرمایۂ تجارت کی مقدار متعین طور پر نہ لکھی ہوئی ہو تو کیا حکم ہے؟	۵۷
۴:- کسی شریک کے کام نہ کرنے یا غائب ہوجانے سے شرکت ختم ہوجائے گی یا نہیں؟	۵۷
۵:- یک طرفہ طور پر شرکت کو ختم کرنے کے لئے دُوسرے شرکاء کا فسخ کو قبول کرنا ضروری نہیں	۵۸
۶:- معاہدے میں کسی شریک کے تحریراً اِستعفاء دینے کے چھ ماہ بعد اُس کی شرکت ختم ہوجانے کے اُصول کی شرعی حیثیت	۵۸
۷:- کسی شریک کے مستعفی ہوجانے کے چھ ماہ بعد بھی دیگر شرکاء اُس کو حصہ دیتے رہے تو اس کی شرکت باقی ہوگی یا نہیں؟	۵۸

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات　　صفحہ نمبر

﴿فصل فی أحکام السّندات المالیّة والصّکوک والأوراق المالیّة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الرّبوٰا والقمار والتّأمین﴾

﴿فصل فی الرّبوٰا وأحکام ربوٰا البنوک والمؤسّسات المالیة الحدیثة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

فصل فی القمار والتّأمین

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی أحکام البنوک﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی البطاقات و أحکامها﴾

﴿کتاب الإجارة﴾

﴿فصل فی نفس الإجارة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

کتاب الودیعة والعاریة

کتاب اللّقطة

کتاب الغصب والضمان

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الجہاد﴾

﴿کتاب الامارۃ والسیاسۃ﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الدّعویٰ والشہادات والقضاء﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الحدود﴾

﴿فصل فی القصاص والدّیات﴾

﴿فصل فی التّعزیر﴾

موضوعات | صفحہ نمبر

***

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین، وعلیٰ کل من تبعھم بإحسان إلیٰ یوم الدین

امابعد.

فتاویٰ عثمانی کی تیسری جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ جیسا کہ پہلی جلد کے شروع میں میں نے عرض کیا تھا، اگرچہ بزرگوں کے اِرشاد کی تعمیل میں فتویٰ نویسی کی خدمت عمر کے بالکل ابتدائی دور ہی میں شروع کردی تھی، اور مشاغل کے ہجوم کے باوجود اَب تک جاری ہے، لیکن یہ اِحساس ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ یہ بڑی نازک اور پُرخطر ذمہ داری ہے، اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور بزرگوں کی دُعائیں شاملِ حال نہ ہوں، تو اِنسان اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

یہ تیسری جلد بطورِ خاص ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن کا تعلق زیادہ تر معاملات سے ہے۔ اور ہمارے دور میں معاملات کی ایسی نئی اور پیچیدہ صورتیں سامنے آگئی ہیں کہ بسااوقات اُن کا صریح حکم فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتا، اس لئے فتویٰ کی ذمہ داری اور زیادہ مشکل اور نازک ہوجاتی ہے، کیونکہ ان مسائل میں فقہی اُصولوں کو صورتِ مسئلہ پر منطبق کرنے کے لئے فقہی نظائر سے حکم مستنبط کرنا پڑتا ہے۔ اس اِستنباط میں غلطی کا اِمکان بھی ہے، اور آراء کے اِختلاف کی بھی گنجائش رہتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی مسئلے کی کئی جہتیں ہوتی ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ اس لئے یہ فتاویٰ لکھتے وقت اگرچہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اپنی بساط کے مطابق پوری تحقیق سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن بہرصورت! یہ ایک بشری کاوش ہے، اور کاوِش بھی ایک ایسے شخص کی جسے اپنی کم علمی اور بے مایگی کا اِحساس ہے۔ اس لئے اسے اس توقع پر شائع کرنے کی اجازت دی ہے کہ اِن شاء اللہ وہ اہلِ علم کی نظر سے گذرے گی تو یا اُس کی تصدیق ہوجائے گی، یا کوئی غلطی ہوئی ہو تو اُس

پر متنبہ ہونے کا موقع مل جائے گا۔ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ فتاویٰ عثمانی کی پہلی دو جلدوں کو بہت سے اہلِ علم وفتویٰ نے محبت کی نظر سے دیکھا ہے، اور ان میں سے کچھ حضرات نے اُس کی بعض فروگذاشتوں پر بھی متنبہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ایسے اُمور کی تصحیح نئے ایڈیشنوں میں کردی گئی ہے، اور جہاں ضروری سمجھا گیا، اس کا اِعلان ماہنامہ ''البلاغ'' میں بھی شائع کردیا گیا ہے۔ اس تیسری جلد کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ حضرات اہلِ علم اُس کو بھی اپنی شفقتوں سے محروم نہیں فرمائیں گے۔

عزیز گرامی قدر مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب نے اس جلد کی ترتیب وتہذیب اور تیاری میں بطورِ خاص جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے، اور جس قابلیت اور سلیقے کے ساتھ اُسے پیش کیا ہے، اُس کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ مختلف رجسٹروں، کاپیوں اور فائلوں سے فتاویٰ کا اِنتخاب کرکے اُن کی ترتیب کے ساتھ تخریج اور تعلیق میں انہوں نے غیر معمولی محنت اُٹھائی ہے، جس کا قارئین کو جزوی اندازہ ضرور ہوجائے گا، لیکن وہ اُن کی حقیقی محنت سے یقیناً بہت کم ہوگا۔ اُن کے لئے میں یہ دُعا ہی کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر، اُن کے علم اور عمل میں ظاہری وباطنی ترقیات عطا فرمائیں، اور ان کو صدق واِخلاص کے ساتھ دِین کی خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

اگر اس کتاب کے کسی حصے سے کسی کو فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے، اور اُن سے میری درخواست ہے کہ وہ اس ناکارہ کو حیاً ومیتاً اپنی دُعاؤں میں یاد فرمالیں۔ **جزاهم الله تعالى خيرًا. وما توفيقي إلّا بالله العليّ العظيم۔**

بندہ

محمد تقی عثمانی عفا اللہ تعالیٰ عنہ

دارالعلوم کراچی

۵؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ

***

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، أَمَّا بَعْدُ:

تقریباً تین سال پہلے حضرت والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی دو جلدیں منظرِ عام پر آئیں جو "کتاب الإیمان و العقائد" سے "کتاب الطلاق" تک کے ابواب پر مشتمل تھیں۔ اب الحمدللہ "فقہ المعاملات" سے متعلق تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جو "کتاب الشرکۃ والمضاربۃ" سے لے کر "کتاب القسمۃ" تک کے ابواب پر مشتمل ہے، اس جلد میں درج ذیل ابواب سے متعلق مسائل ہیں:-

کتاب الشرکۃ والمضاربۃ، کتاب البیوع، کتاب الربا والقمار والتأمین، کتاب الإجارۃ، کتاب الرھن، کتاب الھبۃ، کتاب الودیعۃ والعاریۃ، کتاب اللقطۃ، کتاب الغصب والضمان، کتاب الجھاد، کتاب الامارۃ والسیاسۃ، کتاب الدعویٰ والشھادات والقضاء، کتاب الحدود، کتاب الجنایات، کتاب الصلح، کتاب الوکالۃ، کتاب القسمۃ.

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کو علمی دُنیا میں جو اِمتیازی شان عطا فرمائی ہے، خصوصاً حدیث، فقہ اور فتویٰ کے میدان میں جو مقامِ بلند عطا فرمایا ہے اس کی بنا پر توقعات سے بڑھ کر بحمداللہ ان فتاویٰ کو اہلِ علم اور اَربابِ فتویٰ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، اور چونکہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے قلم میں خداداد کشش اور اَندازِ بیان نہایت آسان و دِلنشیں ہے اس لئے پچھلی دونوں جلدیں اہلِ فتویٰ کے علاوہ عوام الناس میں بھی نہایت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ پچھلی جلدوں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ان کے کئی ایڈیشنوں کی اشاعت، ان کی مانگ میں مسلسل اِضافہ اور مختلف زبانوں میں ترجمے کی درخواستوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے بلکہ اطلاع کے مطابق انگلش اور بنگلہ زبانوں میں اس کا ترجمہ جاری ہے اور حال ہی میں پشتو میں ترجمہ ہوکر یہ جلدیں منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ اُردودان

عوامی طبقے میں بھی اس کتاب نے دیگر کتبِ فتاویٰ کی نسبت اِمتیازی حیثیت حاصل کی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے سامنے جو حضرت کی شخصیت سے واقف ہو ان فتاویٰ کی اِشاعت کا ذِکر ہوتا ہے تو وہ نہایت بے چینی سے کتاب کے حصول کا متلاشی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتبِ تفسیر میں جس طرح حضرت کے عظیم اور جلیل القدر والد ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی معرکۃ الآراء تفسیر ''معارف القرآن'' کو بلندی اور مقبولیت عطا فرمائی ہے، اسی طرح کتبِ فتاویٰ میں ''فتاویٰ عثمانی'' کو بھی عوام وخواص میں ایسی ہی مقبولیتِ عامہ عطا فرمائی ہے، فللّٰہ الحمد ولہ الشکر۔

ایسی صورتِ حال میں بجاطور پر اَحباب کا اِصرار تھا کہ اگلی جلد فوری طور پر منظرِ عام پر آنی چاہئے، ان کا اِصرار اس وجہ سے بھی زیادہ تھا کہ یہ جلد معاملات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کا خصوصی میدان ہے، اور اس کی ضرورت بھی زیادہ پیش آتی ہے، نیز بندہ کی اپنی خواہش بھی یہی تھی کہ تیسری جلد حتی الامکان جلد تکمیل پذیر ہو، مگر بندہ کی کمزوری کے علاوہ ایک اہم سبب اس کی تاخیر کا یہ بھی تھا کہ یہ جلد فقہ المعاملات پر مشتمل تھی جس پر تحقیق وتخریج کا کام بقیہ حصوں کے مقابلے میں نسبتاً دُشوار اور زیادہ توجہ طلب تھا، خصوصاً جدید فقہی مسائل کی تخریج میں اُصولِ فتویٰ کے مطابق اوّلاً تو اس کا صریح جزئیہ اور حوالہ تلاش کیا جاتا ہے، ورنہ قریب ترین نظیر یا قدیم مثال سے استیناس کرنا پڑتا ہے، اور آخری درجے میں اُصولی عبارات سے مسئلے کا حل نکالا جاتا ہے، نیز محض حوالہ جات کے اِعتبار سے ہی نہیں بلکہ مسئلے کے عنوان، ابواب کی ترتیب، موضوعات کی تقدیم وتاخیر، غرض ہر پہلو سے اس جلد کے کام کا پہلی جلدوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا ناگزیر تھا، تاہم اس کے باوجود بندہ اسے اپنی کمزوری قرار دیتے ہوئے اس تاخیر پر معذرت خواہ ہے، اب اِن شاء اللہ چوتھی جلد توقع سے پہلے منظرِ عام پر لاکر اس تاخیر کے اِزالے کی کوشش کی جائے گی۔

فتاویٰ کی دیگر جلدوں کے مقابلے میں اس جلد کو اس اِعتبار سے اِمتیاز حاصل ہے کہ یہ حصہ فقہ المعاملات سے متعلق ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کا خصوصی موضوع اور میدان ہے، اور ایک بزرگ کے بقول اس باب میں اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کو اپنے وقت کا ''اِمام محمد'' بنایا ہے۔ دُنیا بھر میں معاملات کے متعلق جدید فقہی مسائل کے حل کے لئے اُمت کی نظریں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی طرف اُٹھتی ہیں اور مشرق ومغرب کے لوگ جدید مسائل کے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کے پاس سوالات بھیجتے اور حضرت کی رائے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور عرب وعجم میں ہر بڑے علمی فورم پر جدید مسائل میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے کا خصوصی وزن محسوس کیا جاتا ہے، چنانچہ اب تک کتبِ فتاویٰ میں سب سے زیادہ جدید مسائل اس کتاب میں ذِکر کئے گئے ہیں۔

کتاب میں آنے والے فتاویٰ سے متعلق یہاں چند عمومی باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو صرف اس جلد سے متعلق نہیں بلکہ دیگر جلدوں سے بھی متعلق ہیں۔ ایک یہ کہ بعض سوالات کے جوابات میں قاری کو اِجمال واِختصار معلوم ہوتا ہے، قاری یہ سمجھتا ہے کہ اس کا جواب کسی قدر تفصیلی ہونا چاہئے تھا۔ یہاں قارئین پر یہ بات واضح ہو کہ ایسے مقامات پر اِختصار کی کئی وجوہات ہوتی ہیں، ان میں ایک اہم وجہ جو درحقیقت قارئین کے علم میں نہیں ہوتی، یہ ہے کہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے پاس بذریعہ ڈاک جو سوالات آتے ہیں، ان میں بسااوقات مستفتی ایک تفصیلی سوال نامہ بھیجتا ہے، جس میں سائل نے کئی سوالات پوچھے ہوتے ہیں، مگر سائل کا اصل مقصود کوئی ایک سوال ہوتا ہے، جس کی سائل نے مکمل تفصیل طلب کی ہوتی ہے، اور مستفتی کے باقی سوالات جو مختلف نوعیت اور مختلف ابواب سے متعلق ہوتے ہیں ضمنی ہوتے ہیں، جن کے متعلق وہ صرف جواز وعدمِ جواز جاننا چاہتا ہے، زیادہ تفصیل کا وہ طلب گار نہیں ہوتا، چنانچہ حضرتِ والا دامت برکاتہم سائل کے مقصودی اور مرکزی سوال کا تو تفصیلی جواب مرحمت فرماتے ہیں، اور اس کے مختلف النوع ضمنی وجزوی سوالات کا مختصر جواب عنایت فرماتے ہیں۔

اس کے بعد احقر ان مختلف النوع سوالات کو الگ الگ کر کے ہر سوال کو اس کے متعلقہ باب میں منتقل کرتا ہے، قارئین چونکہ سائل کے اصل سوال اور اصل حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں، اس لئے جب وہ کسی سوال کا کوئی مختصر جواب دیکھتے ہیں تو اِجمال محسوس کرتے ہیں، حالانکہ حقیقتاً وہ کسی تفصیلی سوال نامے کا کوئی ضمنی سوال ہوتا ہے جس کے جواب میں اس مقام پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اُصولِ فتویٰ کے مطابق ضروری اِختصار سے کام لیا ہے۔

ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجموعے میں بہت سے فتاویٰ ایسے ہیں جو کافی عرصہ تقریباً چالیس، پچاس سال پہلے لکھے گئے تھے، اور اس عرصے میں بعض مسائل میں چونکہ تحقیق بدل گئی ہے، اس لئے کئی فتاویٰ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم نے نظرِ ثانی کے دوران مناسب مقامات پر تبدیلی فرمادی ہے، تاہم اس کے باوجود اگر کہیں نفسِ مضمون یا فتویٰ یا حوالہ وغیرہ میں کوئی غلطی ہو تو اس کی ذمہ داری بندۂ ناچیز پر ہے، حضرتِ والا کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔

نیز ایک بات یہ بھی ذِکر کرنا ضروری ہے جس کی طرف پہلی جلد میں اشارہ کیا گیا تھا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم سے جو علمی وتحقیق کام لیا ہے، خصوصاً فقہ وفتویٰ کے میدان میں حضرت کی تحقیقات اور فتاویٰ کا کام اتنا ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے کہ اسے منضبط کرنا مشکل ہے، اس لئے اس جلد کے بعد چوتھی جلد بھی بحمداللہ تیاری کے مراحل میں ہے، اور بہت جلد اِن شاء اللہ منصۂ شہود پر

جلوہ گر ہوگی، تاہم چوتھی جلد کی اِشاعت کے بعد بھی یہ کہنا دُرست نہیں ہوگا کہ اس مجموعے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تمام فتاویٰ آگئے ہیں، بلکہ جیسا کہ پہلے ذِکر کیا گیا تھا کہ ''فتاویٰ عثمانی'' دراصل حضرت کے ان فتاویٰ کے مجموعے کا نام ہے جو دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے رجسٹروں میں محفوظ ہوئے ہیں، جبکہ بعض فتاویٰ اِبتداء میں نقل وحفاظت کا اِنتظام نہ ہونے کی وجہ سے شاملِ اِشاعت نہیں ہوسکے، اور ایک بڑی تعداد ان فتاویٰ کی ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم نے دُنیا بھر سے اُردو، انگریزی اور عربی میں آنے والے خطوط کے جوابات میں تحریر فرمائے، اور چونکہ خطوط کی نقل محفوظ رکھنے کا کوئی اِنتظام نہیں ہے اس لئے ایسے فتاویٰ بھی شاملِ اِشاعت نہیں ہوسکے۔ کچھ اہم نوعیت کے بعض خطوط محفوظ رکھے گئے ہیں، ان کو اگرچہ اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی طرح انٹرنیٹ پر بھی بذریعہ ای میل حضرت جوابات عطا فرماتے ہیں جو عموماً معاملات سے متعلق جدید اور اہم نوعیت کے ہوتے ہیں، وہ بھی اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں، اسی طرح ''البلاغ'' انگلش میں بھی سوالات کے جوابات کا ایک مستقل سلسلہ ہے جو حضرتِ والا تحریر فرماتے ہیں، وہ فتاویٰ بھی اس میں شامل نہیں ہیں (البتہ انگریزی فتاویٰ کا ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے)۔

بہرحال! اس مجموعے کی اشاعت کے بعد یہ سمجھنا کہ یہ حضرت کے تمام فتاویٰ ہیں، غلط ہوگا، بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی مجموعوں کی گنجائش ہے، ہماری دُعا ہے اور قارئین سے بھی اس خصوصی دُعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا کو بعافیت عمرِ دراز عطا فرمائیں اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کا سایہ تادیر سلامتی کے ساتھ ہم پر قائم رکھیں تاکہ علوم وعرفان کا یہ سلسلہ چلتا رہے اور اُمت اسی طرح حضرتِ والا کی ذات سے اِستفادہ کرتی رہے۔

آخر میں قارئین سے درخواست ہے کہ اگر وہ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے ساتھ بندہ اور اس کے والدین واساتذہ کو بھی اپنی نیک دُعاؤں میں یاد رکھیں گے تو یہ ان کا اِحسانِ عظیم ہوگا۔

والسلام

محمد زبیر حق نواز

۲؍ربیع الاوّل ۱۴۳۱ھ

***

کتاب الشرکۃ والمضاربۃ

(شرکت ومضاربت (پارٹنرشپ اور سرمایہ کاری) کے مسائل)

۱:- پندرہ فیصد نفع، نقصان کی بنیاد پر ''شرکت'' کا حکم
۲:- مضاربت میں مضارب کے لئے نفع کا ایک حصہ اور تنخواہ مقرّر کرنے کا حکم

سوال:- عرض اینکہ کسی شخص کا سرمایہ بندہ اپنی تجارت میں لگا رہا ہے، اس شخص کو سرمایہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ نفع ونقصان کی ایک خاص نسبت کی بنیاد پر مثلاً پندرہ فیصد منافع اور پندرہ فیصد نقصان کی بنیاد پر اپنے ساتھ شریکِ تجارت کر رہا ہوں، کیا ازرُوئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے؟

۲:- ایک شخص کا صرف سرمایہ ہے، دُوسرے کی صرف محنت ہے سرمایہ نہیں، محنت والے شخص کو مثلاً ۳۰ فیصد فائدہ اور ایک فیصد خاص مقدار تنخواہ بھی دی جائے، جبکہ یہ محنت والا شخص نقصان میں شریک نہیں ہے، ازرُوئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے؟

اُمتی گل، افغان اسٹور

(ابوظہبی، متحدہ عرب امارات)

جواب:- اگر آپ اس شخص سے یہ طے کریں کہ آپ کے اور میرے سرمائے سے تجارت کرنے کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس نفع کا ۱۵ فیصد آپ کا ہوگا، تو یہ صورت جائز ہے۔[۱] البتہ نقصان کی صورت میں ۱۵فیصد کا تعین اسی صورت میں جائز ہوگا جب اس کا لگایا ہوا سرمایہ تجارت کے کل سرمائے کا ۱۵فیصد ہو۔ اگر اس کا لگایا ہوا سرمایہ کل تجارت کے سرمائے کے ۱۵ فیصد سے کم یا زیادہ ہے تو اس صورت میں اُسے ۱۵ فیصد نقصان میں شریک کرنے سے شرکت فاسد ہوجائے گی۔ اُصول یہ ہے کہ نفع کا تناسب تو شرکاء باہمی رضامندی سے جو چاہیں مقرّر کرسکتے ہیں، لیکن نقصان ہمیشہ سرمائے کے تناسب کے مطابق ہونا ضروری ہے، یعنی جس نے جتنا فی صد سرمایہ لگایا اتنا ہی فیصد نقصان بھی اُٹھائے۔[۲]

(۱ و ۲) وفی کنز العمّال ج:۱۵ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲ ص:۱۷۶ الوضیعة علی المال والرّبح علٰی ما اصطلحوا علیہ. وکذا فی مصنف ابن أبی شیبة ج:۵ ص:۴ رقم الحدیث:۱۰ ومصنف عبدالرّزاق ج:۸ ص:۱۴۷ رقم الحدیث:۱۵۰۸۵.

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۲ (طبع سعید) والوضیعة علٰی قدر المالین متساویًا ومتفاضلًا لأنّ الوضیعة اسم لجزء ھالک من المال فیتقدر بقدر المال. وفی فتح القدیر کتاب الشرکة، فصل ولَا تنعقد الشرکة الخ، ج:۶ ص:۱۷۷ (طبع مصطفٰی بابی مصر) وفی طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ ج:۵ ص:۳۹۷ الربّح علٰی ما شرطا والوضیعة علٰی قدر المالین الخ. وکذا فی التتارخانیة ج:۵ ص:۶۵۵ (طبع ادارۃ القرآن) والمحیط البرھانی ج:۶ ص:۴۰۱ (طبع غفاریہ کوئٹہ)، وعامة کتب الفقہ.

۲:- یہ صورت جائز نہیں ہے، آپ یا تو اس کا نفع میں کچھ فیصد حصہ رکھیں، پھر تنخواہ مقرّر کرنا جائز نہیں[۱]، کیونکہ یہ مضاربت ہوگی[۲]، یا تنخواہ مقرّر کریں اور وہ متعین رقم ہو، نفع کا فی صد نہ ہو، نفع میں بحیثیت شریک حصہ دار کوئی فیصد حصہ مقرّر نہ کریں، اس صورت میں یہ اجارہ ہوگا، دونوں چیزوں کو جمع کرنا دُرست نہیں۔[۳]

واللہ اعلم

۱۲/۷/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۱۳۶۵ ہ)

(شرکت ومضاربت سے متعلق چند اہم سوالات اور ان کے جوابات)

۱:- نفع کی ایک مقرّر مقدار تک مضاربت ختم نہ کرنے کے معاہدے کا حکم

سوال:- دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا رَبّ المال مضارب سے یہ معاہدہ کرسکتا ہے کہ جب تک مضارب ایک لاکھ نفع نہ کمالے اس وقت تک مضاربت ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوگا؟ اگر یہ معاہدہ کرلیا تو کیا اِس کا پورا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟

جواب:- جو شرط آپ نے لکھی ہے، اس کا جواز نظر نہیں آتا[۴]، کیونکہ یہ غیر محدود مدّت تک مضارب کو پابند کرنے کے مرادف ہے[۵]، اور اس میں فی الجملہ رَبّ المال کے نفع کی ضمانت بھی ہے۔[۶]

(۱ و ۲) وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۲۶ کتاب الشرکۃ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ مطلب یرجع القیاس الخ (طبع سعید). لا أجر للشریک فی العمل بالمشترک.

وفی النتف فی الفتاویٰ کتاب الاجارۃ اجارۃ الشریک شریکہ ص:۳۴۹ (طبع سعید) ولو کان طعام بین رجلین فقال أحدھما لصاحبہ احملہ الی الموضع کذا ولک فی نصیبی من الأجر کذا، أو قال اطحنہ ولک فی نصیبی کذا من الأجر، جاز ذٰلک فی قول زفر ومحمد بن صاحب ولا یجوز فی قول أبی حنیفۃ وأبی یوسف ومحمد رحمھم اللہ تعالٰی.

(۳) وفی المعجم الأوسط للطبرانیؒ ج:۲ ص:۱۲۹ (طبع دار الحرمین قاھرۃ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ثم لا تحلّ صفقتان فی صفقۃ. وفی مجمع الزوائد ج:۴ ص:۸۴ (طبع دار الرّیان للتراث قاھرۃ و دار الکتاب العربی بیروت) عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: نھٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صفقتین فی صفقۃ واحدۃ.

(۴ و ۵) وفی البدائع للکاسانی ج:۶ ص:۱۰۹ (طبع سعید) وأما صفۃ ھٰذا العقد یعنی المضاربۃ فھو أنہ عقد غیر لازم ولکل واحد منھما اعنی رب المال والمضارب الفسخ لٰکن عند وجود شرطہ وھو علم صاحبہ.

نیز مضاربت کی توقیت اور لزوم کی دوصورتوں اور ان کے حکم سے متعلق تفصیلی حوالہ جات کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب بحوث فی قضایا فقھیۃ معاصرۃ ج:۲ ص:۱۷۳ تا ۱۷۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۶) دیکھئے صفحہ:۴۲ و ۴۸ کے حواشی۔

۲:- فسخِ مضاربت کی صورت میں سارا مال رَبّ المال کے حوالے کرنے کے معاہدے کا حکم

سوال:- کیا رَبّ المال مضارب سے یہ معاہدہ کرسکتا ہے کہ اگر مضاربت ختم کرنے کا ارادہ ہوا تو مضارب سارا مال رَبّ المال کے حوالے کردے، اور رَبّ المال کی جگہ پر لے جاکر اس کی سیٹنگ کردے، اگر ایسا معاہدہ کرلیا ہو تو کیا مضارب پر اس کی پابندی ضروری ہے؟

جواب:- فسخِ مضاربت پر اگر رقم نقد ہو تو مضارب اسے واپس کرنے کا پابند ہے، نقد نہ ہو تو تنضیض کا[1]، البتہ اگر رَبّ المال عروض خریدنا چاہے تو جائز ہے[2]، اس صورت میں اگر قیمتِ خرید میں نفع ہو تو وہ بھی جانبین میں تقسیم ہوگا، پہلے سے یہ شرط کہ فسخ ہونے پر مال رَبّ المال کو بیچا جائے گا، عقدِ مضاربت میں نہیں لگائی جاسکتی، ہاں اگر عقد اس شرط سے خالی ہو، اور بعد میں مضارب وعدہ کرلے تو جائز ہے۔ البتہ مالِ مضاربت اگر عروض کی شکل میں ہو، اور ربح ظاہر ہوچکا ہو، اور مضارب ربّ المال سے یہ مطالبہ کرے کہ یہ مال میں خریدنا چاہتا ہوں تو رَبّ المال اِنکار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں:-

وان كان فى تلك العروض فضل أجبر المضارب علىٰ بيعها على المضاربة حتى يستوفى رب المال رأس ماله، ويكون الفضل ان كان،

---

(۱) وفى الهداية كتاب المضاربة فصل فى العزل والقسمة ج:۳ ص: ۲۷۰ و ۲۷۱ (طبع مكتبه رحمانيه) وفى طبع سعيد ج:۳ ص: ۲۲۱ وأن كانا يقتسمان الرّبح والمضاربة بحالها ثم هلك المال بعضه أو كلّه ترادا الربح حتى يستوفى ربّ المال رأس المال لأنّ قسمة الرّبح لا تصحّ قبل استيفاء رأس المال لأنّه هو الأصل وهٰذا بناء عليه وتبع لهٗ.
وفى المبسوط للسرخسيؒ: الرّبح لا يظهر ما لم يسلم جميع رأس المال لربّ المال لأنّ الرّبح اسم للفضل فما لم يحصل ما هو الأصل لربّ المال لا يظهر الفضل فقال صلى الله عليه وسلم مثل المؤمن كمثل التاجر لا تخلص لهٗ نوافله ما لم تخلص لهٗ فرائضه فالتّاجر لا يسلم له الرّبح حتّى يسلم له رأس ماله .... الخ.
وفى بدائع الصنائع ج:۶ ص:۱۰۷ وانّما يظهر الرّبح بالقسمة وشرط جواز القسمة قبض رأس المال فلا تصحّ قسمة الرّبح قبل قبض رأس المال .... الخ.
دیگر ائمہ کے نزدیک بھی فسخ مضاربت پر نفع کی حتمی تقسیم کے لئے سرمایہ اور اثاثے کو نقد میں تبدیل کرنا ضروری ہے، دیکھئے: منهاج الطالبين ص:۶۵، والشرح الصغير على اقرب المسالك ج:۳ ص:۷۰۰ لعلّامه احمد الدردير المالكيؒ و المغنى لابن قدامة ج:۵ ص:۳۳ (طبع دارالفكر)۔

(۲) وفى بدائع الصنائع ج:۶ ص:۱۰۱ (طبع سعيد) ويجوز شراء ربّ المال من المضارب وشراء المضارب من ربّ المال وان لم يكن فى المضاربة ربح فى قول أصحابنا الثلاثة، وقال زفر لا يجوز الشراء بينهما فى مال المضاربة وجه قول زفر ان هٰذا بيع ماله بماله .... ولنا أنّ لربّ المال فى مال المضاربة ملك رقبة لا ملك تصرّف وملكه فى حقّ التّصرّف كملك الأجنبى وللمضارب فيه ملك التصرّف لا الرقبة فكان فى حق ملك الرقبة كملك الأجنبى حتّى لا يملك ربّ المال منعه عن التّصرف فكان مال المضاربة فى حق كل واحد منهما كمال الأجنبى لذٰلك جاز الشراء بينهما .... الخ.
وفى الهندية الباب الرّابع (المضاربة) إذا باع ربّ المال مال المضاربة من المضارب أو باعه المضارب من ربّ المال فهو جائز سواء كان فى المال فضل علىٰ رأس المال أو لم يكن.

بینهما علٰی ما أشترطا، إلّا أن یشاء المضارب أن یعطی رَبّ المال رأس ماله وحصته من الربح ویحبس العروض بنفسه فلا یکون لربّ المال الامتناع عنه. (الشروط الصغیر للطحاوی ج:۲ ص:۱۳۱ ۷ طبع بغداد)[۱]

جہاں تک سیٹنگ کی شرط کا تعلق ہے وہ اموالِ مبیعہ کی حالت پر موقوف ہے، اگر اموال ایسے ہیں جن میں گھر پر لے جا کر سیٹ کرنا تجار میں متعارف ہے، تو یہ شرط جائز ہے، ورنہ فاسد۔

۳:- نقدی کے بجائے ''مضاربت بالعروض'' کا حکم

سوال:- اگر رَبّ المال نقدی کی بجائے عروض (سامان) مضارب کو دیتا ہے تو کیا اس طرح مضاربت دُرست ہے؟

جواب:- حنفیہ اور جمہور کے نزدیک مضاربت بالعروض دُرست نہیں،[۲] اِلَّا یہ کہ انہیں بیچ کر نقد بنالیا جائے، البتہ امام احمدؒ کی ایک روایت میں جائز ہے،[۳] اور وقتِ عقد کی قیمت کو رأس مال المضاربہ قرار دیا جائے گا،[۴] (الانصاف للمرداوی ج:۵ ص:۴۰۹)۔[۵] حاجت کے وقت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے شرکۃ بالعروض میں مالکیہ کا قول[۶] اختیار کرنے کی گنجائش دی ہے۔ (امداد الفتاویٰ

---

(۱) وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲۲ ص:۷۲ طبع مکتبہ غفاریہ کوئٹہ (باب نفقة المضارب) واذا اشتری المضارب بمال المضاربة متاعًا وفیه فضل أو لا فضل فیه فأراد المضارب أن یمسکهٗ حتّٰی یجد به ربحًا کثیرًا وأراد ربّ المال أن یبیعهٗ فان کان لا فضل فیه أجبر المضارب علٰی أن یبیعه أو یعطیه ربّ المال برأس ماله لأنّهٗ لاحق للمضارب فی المال فی الحال فهو یرید أن یحول بین ربّ المال وبین ماله بحقٍ موهومٍ ...... وان کان فیه فضل وکان رأس المال ألفًا والمتاع یساوی ألفین فالمضارب یجبر علٰی بیعه لأنّ فی تاخیره حیلولة بین ربّ المال وبین ماله وهو لم یرض بذٰلک حین عاقدهٗ عقد المضاربة إلّا أن للمضارب هنا أن یعطی ربّ المال ثلثة أرباع المتاع برأس ماله وحصته من الرّبح ویمسک ربع المتاع وحصته من الربح ولیس لربّ المال أن یأبٰی ذٰلک علیه لأنّ الربح حق والانسان لا یجبر علٰی بیع ملک نفسه لتحصیل مقصوده. (محمد زبیر حق نواز)

(۲) وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ لا تصحّ الشرکة فی العروض. وفیه أیضًا معنی الوکالة من لوازم الشرکة والوکالة التی یتضمنها الشرکة لا تصحّ فی العروض .... الخ. وکذا فی المبسوط للسرخسیؒ ج:۱۱ ص:۱۵۹.

وفی مجلّة الأحکام ج:۴ ص:۱۳۴۲ (طبع نور محمد کتب خانه) لا تصحّ الشرکة علی الأموال الّتی لیست معهودة من النقود کالعروض والعقار أی لا تجوز أن تکون هٰذه رأس مال للشرکة.

(۳ و۴) وفی المغنی لابن قدامة ج:۵ ص:۱۰ و ۱۱ (طبع دارالفکر بیروت) فأمّا العروض فلا تجوز الشرکة فیها فی ظاهر المذهب نصّ علیه أحمد. .... وعن أحمد روایة أُخریٰ أنّ الشرکة والمضاربة تجوز بالعروض وتجعل قیمتها وقت العقد رأس المال، قال أحمد اذا اشترکا فی العروض یقسم الرّبح علی ما اشترطا.

(۵) کتاب الشرکة (طبع مکتبة علمیة) فعلی الرّوایة الثانیة ویجعل رأس المال قیمتها وقت العقد ... الخ.

(۶) وفی الشرح الصغیر علٰی أقرب المسالک للدّردیر ج:۳ ص:۴۵۹ وتصحّ (بعین) من جانب (وبعرض) من الأخر (بعرضین) من کلّ جانب عرض (مطلقًا) اتفقا جنسًا أو اختلفا کعبد وحمار أو ثوب.

وفی المغنی لابن قدامة ج:۵ ص:۱۱ (طبع دارالفکر) ...... مقصود الشرکة جواز تصرفهما فی المالین جمیعًا وکون ربح المالین بینهما وهٰذا یحصل فی العروض کحصوله فی الأثمان فیجب أن تصحّ الشرکة والمضاربة بها کالأثمان.

ج:۳ ص:۴۹۵)[1]۔ یہ گنجائش یہاں بھی ہوسکتی ہے۔[2]

۴:- مضارب کے لئے فسخِ مضاربت کے وقت رَبّ المال کے بجائے کسی اور کو مال فروخت کرنے کا حکم

سوال:- مضاربت ختم کرنے کا ارادہ ہوا تو رَبّ المال نے کہا: ''سارا مال مجھ کو فروخت کردو'' مگر مضارب کہتا ہے کہ: ''میں آپ کو نہیں دوں گا بلکہ میں اپنے فلاں دوست کو فروخت کروں گا'' تو کیا مضارب کو اس کا اختیار ہے کہ رَبّ المال کے بجائے اپنے دوست کو فروخت کرے؟

جواب:- اگر مضارب کا دوست زیادہ قیمت دے رہا ہو تو یقیناً وہ مقدم ہے، لیکن اگر قیمت دونوں برابر دینا چاہتے ہوں تو اس کا صریح جزئیہ تو یاد نہیں، لیکن قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ رَبّ المال اسے مجبور نہ کرسکے، کیونکہ مالِ مضاربت میں حقِ تصرف کلیۃً مضارب کو حاصل ہوتا ہے،[3] رَبّ المال کو مداخلت کا حق نہیں ہوتا،[4] اگرچہ دُوسری جہت یہ ہے کہ رَبّ المال کو ابتدائی ملکِ رقبہ حاصل ہونے کی بنا پر ترجیح دی جائے، لیکن بظاہر یہ محض اخلاقی ترجیح ہے، قضاءً اس پر مجبور کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

۵:- شرکت و مضاربت اِکٹھے کرنے کی صورت میں دونوں کا نفع اِکٹھا فیصد کے طور پر مقرّر کرنے کا حکم

سوال:- اگر ایک شخص دُوسرے کے ساتھ شرکت اور مضاربت دونوں معاملات اِکٹھے کرنا چاہتا ہے تو دونوں معاملات کا نفع اِکٹھے فیصد میں متعین ہوسکتا ہے؟ مثلاً ایک نے دُوسرے کو لاکھ روپیہ بطور شرکت اور لاکھ روپیہ بطور مضاربت دیا اور کہا کہ: ''مجموعی طور پر جو نفع ہو اس کا ۴۰ فیصد دینا'' تو کیا اس طرح دُرست ہے؟

---

(۱) طبع مکتبہ دار العلوم کراچی.

(۲) جیسا کہ المغنی لابن قدامة میں شرکت کے ساتھ مضاربت بالعروض کے جواز کی بھی صراحت کی گئی ہے۔
وفی المغنی لابن قدامة ج:۵ ص:۱۱ (طبع دارالفکر) .... مقصود الشركة جواز تصرفهما فی المالین جمیعًا وكون ربح المالین بینهما وهذا یحصل فی العروض كحصوله فی الأثمان فیجب أن تصح الشركة والمضاربة بها كالأثمان.
نیز جس مال سے شرکت جائز ہے اس سے مضاربت بھی جائز ہے، كما فی الهداية ج:۳ ص:۲۱۳ طبع سعيد وفی طبع مكتبه رحمانیه ج:۳ ص:۲۶۳ ولا تصحّ إلّا بالمال الّذی تصح به الشركة .... الخ.

(۳ و ۴) وفی الهداية ج:۳ ص:۲۱۴ (طبع سعيد) واذا صحت المضاربة مطلقة جاز للمضارب أن یبیع ویشتری ویوكل ویسافر ویبضع ویودع. وفیها أیضًا قبلها ج:۳ ص:۲۱۴ (طبع سعيد) ولا بدّ أن یكون المال مسلمًا الی المضارب ولا ید لربّ المال فیه .... الخ.

جواب:- یہ صورت اسی وقت متصوّر ہوسکتی ہے جب مضارب بھی اپنا سرمایہ لگا رہا ہو، لہٰذا اگر مجموعی کاروبار ایک ہی ہے تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ دو لاکھ بطور مضاربت دیئے اور مضارب کو اپنا سرمایہ لگانے کی اجازت دی،(۱) اس صورت میں شرط صرف یہ ہے کہ ربّ المال کا حصۂ نفع مال شرکت میں اس کے رأس المال کے تناسب سے زائد نہ ہو، لہٰذا چالیس فیصد نفع کا جواز اس بات پر موقوف ہے کہ مضارب اپنی طرف سے کتنا سرمایہ لگا رہا ہے؟ کیونکہ شرط عدم العمل کی صورت میں شریک اپنے رأس المال کے تناسب سے زیادہ حصہ متعین نہیں کرسکتا، وراجع البدائع،(۲) ایسی صورت میں نفع کی تقسیم کے طریقے پر بندے نے اپنی اس انگریزی کتاب میں بحث کی ہے جس کا ترجمہ مولانا زاہد صاحب نے ''اسلامی بینکاری کے اُصول'' کے نام سے کیا ہے۔

۶:- ایک شریک بغیر عمل کے پانچ لاکھ روپے دُوسرا ایک لاکھ بمع عمل شرکت کریں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- دو شخص شرکت کا معاملہ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک شخص ۵ لاکھ روپیہ دے گا لیکن کام نہیں کرے گا، اور دُوسرا ایک ہزار روپیہ دے گا لیکن ساتھ کام بھی کرے گا، لیکن نفع دونوں میں نصف نصف تقسیم ہوگا، تو کیا اس طرح دُرست ہے؟ اگر دُرست ہے تو اس میں اور مضاربت میں کیا فرق ہوگا؟ بندے کے خیال میں صرف دو فرق ہیں، ۱- کام کرنے والا $\frac{1}{500}$ نقصان بھی برداشت کرے گا، ۲- مال خریدنے کے بعد اس کی مالیت میں اضافہ ہوا تو $\frac{1}{500}$ کے بقدر کام کرنے والا بھی شریک ہوگا۔ ان دو کے علاوہ کیا کچھ اور بھی فرق ہے؟

بندہ محمد عامر عفی عنہ

خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

جواب:- فرق نمبر۱ دُرست ہے،(۳) نمبر۲ دُرست نہیں، کیونکہ کام کرنے والا نفع کے اضافے میں $\frac{1}{500}$ کے حساب سے نہیں بلکہ طے شدہ تناسب (یعنی نصف نصف) کے حساب سے شریک ہوگا۔(۴)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

---

(۱) وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲۲ ص:۱۳۳ خلط ألف المضاربة بألف من ماله قبل الشراء جاز.

(۲) بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۳ (طبع سعید).

(۳ و ۴) وفی مصنف عبدالرّزاق ج:۸ ص:۱۴۷ رقم الحدیث:۱۵۰۸۵ وکنز العمّال ج:۱۵ ص:۱۷۶ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲ الوضیعة علی المال والرّبح علی ما اصطلحوا علیه وکذا فی مصنّف ابن أبی شیبة ج:۵ ص:۴ وفتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۷.

کم سے کم ۵ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ فیصد منافع دینے والے ادارے ''صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ'' میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ آج کل کراچی میں کاروباری ادارے عوام سے رقم لے کر اپنے کاروبار میں لگاتے ہیں، اور اس کے منافع عوام میں بھی تقسیم کر رہے ہیں، یہ ادارے پہلے سے مقرّر کردہ منافع بھی دیتے ہیں، جو کہ سود ہے۔ بعض ادارے باقاعدہ منافع کی تقسیم کر رہے ہیں جو ہر ماہ کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے اور ان کا کام تقریباً بینک جیسا ہے، جو عوام کا پیسہ لے کر مختلف کاروباروں میں لگاتے ہیں اور منافع کھاتہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک ادارہ ''صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ کارپوریشن'' ہے جو زمینوں، پلاٹوں اور مکانات وغیرہ کا کاروبار کرتا ہے، اس کا منافع بھی بڑھتا یا کم ہوتا رہتا ہے، جو کہ سود کی تعریف میں نہیں آتا۔ پچھلے دنوں انہوں نے مختلف مہینوں میں سات فیصد، ساڑھے آٹھ فیصد اور نو فیصد منافع بھی دیا ہے، لیکن ان کے ساتھ حصے میں لکھا ہوتا ہے کہ پانچ فیصد سے بیس فیصد تک منافع دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ:

۱:- کم سے کم منافع پانچ فیصد مقرّر کرنے سے کیا یہ سود کی تعریف میں آئے گا؟ جبکہ منافع بہرحال کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

۲:- زیادہ سے زیادہ بیس فیصد حد مقرّر کردینے سے کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟

۳:- اس کاروبار کو جائز شرعی صورت دینے کے لئے معاہدے میں کیا تبدیلی کرنی ہوگی؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب:- اس قسم کے کاروبار کا جائز یا ناجائز ہونا اس کاروبار کے مفصل طریقِ کار پر موقوف ہے، صرف ایک آدھی بات دیکھ کر کوئی حتمی حکم لگانا دُرست نہیں، لہٰذا جس کاروبار کے بارے میں حکم معلوم کرنا ہو، اس کے طریقِ کار کی تفصیل لکھئے تب جواب دیا جاسکے گا۔

۱:- اگر معاہدے میں یہ طے کرلیا جائے کہ سرمایہ کا کم سے کم پانچ فیصد نفع ضرور دیا جائے گا

تب یہ سود ہے۔[۱]

۲:- زیادہ سے زیادہ نفع مقرّر کرنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، متعلقہ کاروبار کی تفصیل لکھیں تو جواب دیا جاسکے گا۔ یہ دونوں باتیں اس وقت ہوں جب معاہدے میں کم سے کم منافع کی شرح سرمائے کے تناسب سے طے کی گئی ہو، لیکن اگر معاہدہ یہ ہو کہ جو کچھ بھی منافع ہوگا اس منافع کا ۵ یا دس فیصد دیا جائے گا، اور اگر کچھ منافع نہ ہو تو کچھ نہ دیا جائے گا،[۲] لیکن ساتھ ہی سرمایہ لگانے والے کو یہ بتادیا گیا کہ عموماً اس کاروبار میں اتنے فیصد تک نفع ہوتا ہے، تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۷/۱۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸/۱۸۵۶ د)

مشترک مالِ تجارت باہر سے منگوانے کی صورت میں اگر جہاز ڈُوب جائے تو شریک سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال:- ہم نے ایک مال چائنا سے منگوایا تھا، اس مال میں ایک صاحب کی شراکت تھی، نفع نقصان آدھا آدھا، مال منگوانے میں پورا پیسہ ہم نے لگایا کیونکہ ہمارا اور اُن کا اس طرح شرکت کا مال آتا رہتا ہے کہ کبھی ہم نے منگوایا، کبھی انہوں نے منگوایا، کبھی پیسہ بعد میں ہم نے دے دیا، کبھی پیسہ

(۱ و ۲) وفی الهندية ج:۲ ص:۳۰۲ (طبع رشيديه كوئٹه) وأن يكون الرّبح معلوم القدر فان كان مجهولًا تفسد الشركة وأن يكون الرّبح جزأً شائعًا فی الجملة لا معيّنًا فان عينا عشرة أو مائة أو نحو ذٰلک كانت الشركة فاسدة.

وفی الهداية ج:۲ ص:۶۱۱ (طبع مكتبه رحمانيه) ولا يجوز الشركة اذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الرّبح لأنّه شرط يوجب انقطاع الشركة فعساه لا يخرج الّا قدر المسمّى لأحدهما ونظيره فی المزارعة.

وفی مجمع الأنهر ج:۲ ص:۵۴۴ (طبع مكتبه غفاريه) وركنها الايجاب والقبول وشرطها عدم ما يقطعها كشرط دراهم معيّنة من الرّبح لأحدهما.

وفی الدّر المنتقی مع مجمع الأنهر كتاب المضاربة ج:۳ ص:۴۴۶ (طبع مكتبه غفاريه كوئٹه) وكون الرّبح بينهما مشاعًا فتفسد ان شرط لأحدهما عشر دراهم مثلًا.

وفی تبيين الحقائق ج:۴ ص:۲۴۸ كتاب الشركة (طبع سعيد) وتفسد ان شرط لأحدهما دراهم مسمّاة من الرّبح لأنّه شرط يوجب انقطاع الشركة فی بعض الوجوه فلعلّه لا يخرج الّا القدر المسمّٰى لأحدهما من الرّبح.

وكذا فی البحر الرائق ج:۵ ص:۱۷۷ (طبع سعيد) وخلاصة الفتاوىٰ ج:۴ ص:۲۹۴ (طبع امجد اكيڈمی لاهور)

وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة:۱۳۳۷ ج:۲ ص:۷۱۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) يشترط أن تكون حصص الرّبح الّتی تنقسم بين الشركاء جزأً شائعًا كالنّصف والثلث والربع فاذا اتفق الشركاء علىٰ اعطاء أحدهم قدرًا معيّنًا كانت الشركة باطلة. وكذا فی شرح المجلّة للأتاسی ج:۴ ص:۲۶۱ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه).

بعد میں انہوں نے دے دیا، بہرکیف دس بارہ سال سے کاروباری تعلقات ہیں، اور ایک دُوسرے کو ایک دُوسرے پر پورا بھروسہ ہے۔ یہ مال جس جہاز پر آرہا تھا وہ خداوندِ قدوس کی مرضی سے پورا کا پورا ڈُوب گیا، کیا ہم اس مال کی جس کی ہم نے ادائیگی پوری کی پوری کردی ہے اس کی آدھی رقم حمید صاحب سے جو نفع ونقصان میں شریک تھے لے سکتے ہیں؟

جواب:- اگر مال منگوانے سے پہلے شرکت کا یہ معاہدہ ہوچکا تھا کہ مال منگوانے میں دونوں فریق آدھا آدھا روپیہ لگائیں گے اور نفع ونقصان میں نصف نصف شریک ہوں گے، اور پھر مال اسی معاہدے کے تحت ان کے علم اور اِطلاع سے منگوایا گیا تھا، تو اس مال کے منگوانے میں جو رقم خرچ ہوئی آپ کے شریک اس کا نصف حصہ آپ کو دینے کے ذمے دار ہیں، خواہ مال وصول ہوا ہو یا ڈُوب گیا ہو۔ بدائع میں ہے:

"واختلاط الربح يوجد ون اشترى كل واحد بمال نفسه علىٰ حدة، لأن الزيادة وهى الربح تحدث على الشركة ...... حتّى لو هلك بعد الشراء بأحدهما كان الهالك من المالين جميعًا لأنه هلك بعد تمام العقد."

(بدائع ج:۶ ص:۲۰)(۱)

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۲۸/ ۲۷ ہ)

کاروبار میں شرکت کے لئے رقم دینے کے بعد نفع کے بجائے ماہانہ سود کا مطالبہ کرنے کا حکم

سوال:- دو سال ہوئے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، بوقتِ انتقال والد صاحب پر قرضہ تھا، جو کہ والد صاحب کے کاروبار سے ادا کیا جارہا ہے، اِن شاء اللہ حال ہی میں تمام قرضہ ادا ہوجائے گا۔ ایک شخص ایسا بھی ہے کہ اُس نے چلتے ہوئے کاروبار یعنی والد صاحب کی دُکان میں دس

(۱) طبع سعید، وفی فتح القدير ج:۵ ص:۳۹۹ (طبع رشيديه كوئٹه) .... بخلاف ما بعد الخلط حيث يهلك على الشركة لأنه لا يتميّز فيجعل الهالك من المالين، وان اشترىٰ أحدهما بماله وهلك مال الآخر قبل الشراء فالمشترى بينهما علىٰ ما شرطا لأن الملك حين وقع وقع مشتركًا بينهما لقيام الشركة وقت الشراء ...الخ.
وفى درر الحكام شرح غرر الأحكام، أركان الشركة وشروطها وبعدهٗ أى بعد الخلط يهلك عليهما لأنهٗ لا يتميّز فيهلك من المالين فان هلك مال أحدهما بعد شراء الآخر بماله فمشريه لهما علىٰ ما شرطا لأنّ الملك حين وقع وقع مشتركًا بينهما لقيام الشركة وقت الشراء فلا يتغيّر الحكم بهلاك مال الآخر. وراجع أيضًا الى الفتاوى الهندية ج:۴ ص:۳۰۹ الىٰ ص:۳۱۱ (طبع رشيديه كوئٹه).

ہزار روپیہ لگا کر شراکت کی، لیکن دو ماہ کے بعد شرکت کی بجائے سود لینے کا مطالبہ کر دیا، ورنہ دس ہزار کی واپسی کا مطالبہ کر دیا، اس لئے مجبوراً ماہانہ سود دینا پڑا، اس طرح کچھ عرصہ سود دیا جاتا رہا لیکن دُکان دن بدن منڈی والوں کی مقروض ہوتی چلی گئی اور دُکان کا کاروبار ختم ہوگیا، مجبوراً والد صاحب بیرون ملک چلے گئے تا کہ اس شخص کا قرض ادا کیا جائے، قرض کی ادائیگی کے وقت سود کے نام پر جو رقم دی گئی ہے وہ منہا کر کے دی جائے یا پوری دی جائے؟

جواب:- سود کی رقم کا لین دین جائز نہیں ہے،[1] دو ماہ بعد سود کے مطالبے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شرکت ختم کر دی، ایسی صورت میں حساب ہونا چاہئے تھا، اور اس وقت نفع یا نقصان میں جو حصہ بنتا وہ ان کو دِیا جاتا، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا، اس لئے اب اندازہ لگائیں کہ جب شرکت ختم ہوئی، اس وقت دُکان میں نفع تھا یا نہیں، اگر نفع تھا تو جو رقم سود کے طور پر دی گئی، وہ اگر نفع کے برابر ہو تو ٹھیک، اور زائد ہو تو اُسے منہا کر کے انہیں اصل رقم واپس کر دیں جو دس ہزار روپے ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۰/ ۲۸ ج)

تاج کمپنی لمیٹڈ میں ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی شرط پر سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- تاج کمپنی لمیٹڈ قرآنِ حکیم کی طباعت اور نشر و اِشاعت کا ایک معروف ادارہ ہے، عوام الناس کو شرکت کی دعوت دیتا ہے، ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی پیشکش کرتا ہے، اس میں سرمایہ لگا کر منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ منافع اگر کاروبار کے مجموعی منافع کے بجائے لگائی ہوئی رقم کا ۱۵ یا ۲۰ فیصد ہوتا ہے تو یہ منافع نہیں بلکہ سود ہے،[2] اور اس کا لین دین جائز نہیں،[3] جائز صورت صرف یہ ہے کہ جو شخص جتنی رقم لگائے وہ کاروبار کے نفع ونقصان دونوں میں شریک ہو اور کل سرمایہ کی جتنی فیصد رقم اُس نے لگائی ہے نفع کا اُتنا ہی فیصد وصول کرے، دی ہوئی رقم پر معین شرح سے فیصد وصول کرے اور کاروبار خواہ قرآن مجید کی نشر و اشاعت کا ہو اس کی بنا پر سود جائز نہیں ہوسکتا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۳/ ۲۸ ب)

---

(۱) حوالے کے لئے دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔
(۲و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۲، ۴۸، ۵۳ وص:۵۴ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

کھانے میں روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس مشترک ہونے کی صورت میں تقسیم میں مساوات ضروری ہے یا نہیں؟

سوال:- چند احباب نے برابر اپنے کھانے کے لئے پیسے جمع کئے اور ان پیسوں سے سالن روٹی وغیرہ تیار ہوئی، سالن میں بھی اور روٹیوں میں بھی ہر ایک کی برابر رقم لگی ہوئی ہے، دسترخوان پر ہر چیز میں برابر ہر ایک شریک ہے، لیکن کھانا جب کھایا جاتا ہے تو اس میں ظاہر ہے کمی زیادتی ہونا لازمی امر ہے، ایک عالم اس کو جائز کہتے ہیں، مختلف اجناس ہونے کی وجہ سے کمی زیادتی جائز ہے، دُوسرے صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہ شرکت اور اس میں بغیر تقسیم مال ہر ایک کا حصہ جدا کئے بغیر جائز نہیں، اور تقسیم بھی برابری میں ہو کیونکہ شرکت ہر چیز میں برابر ہے، ان کے دلائل یہ ہیں: فشركة الأملاك العين يرثها رجلان ويشتريانها فلا يجوز لأحدهما أن يتصرّف فى نصيب الآخر الّا باذنه وكل واحد منهما فى نصيب صاحبه كالأجنبى الى أن قال الّا فى صورة الخلط والاختلاط فانه لا يجوز الّا باذنه. هدايه (ج:۲ ص:۲۰۵)[1]۔ اور ردّالمحتار میں ہے: قوله من حيث الأمانة فان مال أحد الشريكين أمانة فى يد الآخر كما ان مال المفقود أمانة فى يد الحاضر. (ج:۴ ص:۲۹۸)[2]۔

اس لئے یا تو ہر ایک کا حصہ الگ پہلے کر دیا جائے اور سب کا برابر سالن بھی برابر اور روٹی بھی برابر یا روٹی کے بدلے سالن زیادہ لے یا سالن کے بدلے روٹی سب کی رضامندی سے ایسی شرکت کا امتیاز کرلیا جائے تو پھر صحیح ہے اور یہ مشکل ہے، اس لئے اس شرکت میں قباحتیں ہیں اُوپر کی دو مختلف اجناس میں کمی زیادتی جائز ہے، یہ اُصول تقسیم کا ہے جو یہاں واقع نہیں ہوا اس لئے جائز نہیں، اس لئے ایسا کرلیا جائے کہ یہ تمام احباب ایک شخص کو رقم دے دیں اور وہ ان سب کی اپنی طرف سے دعوت کردے۔ پہلی صورت میں جواز کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس ہیں، اس لئے تقسیم میں مساوات رِبا سے بچنے کے لئے ضروری نہیں بلکہ باہمی رضامندی سے تفاضل جائز ہے، چنانچہ جب سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تو ہر شخص جتنا کھا رہا ہے وہ اس کا حصہ سمجھا جائے گا، بشرطیکہ تمام شرکاء راضی ہوں، لہٰذا کوئی اشکال نہیں۔ البتہ اگر اس طرح صرف ایک ہی ایسی چیز خریدی جائے جو یا وزنی ہو یا کیلی تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تقسیم میں مساوات ضروری ہوگی، لہٰذا یا تو اس

---

(۱) هداية، كتاب الشركة ج:۲ ص:۲۰۵ (طبع مكتبه رحمانيه).
(۲) ردّ المحتار، كتاب الشركة ج:۴ ص:۲۹۸ (طبع سعيد).

کے ساتھ کوئی دُوسری جنس کی چیز شامل کرلی جائے جیسے قربانی کے گوشت میں فقہائے کرام نے لکھا ہے، یا پھر سب لوگ مل کر اپنی اپنی رقم کا مالک ایک شخص کو بنادیں، وہ اپنے لئے وہ چیز خرید لے، پھر وہ اپنی خوشی سے سب کی دعوت کردے، جیسا کہ سوال میں لکھا گیا ہے۔ لیکن امام بخاریؒ نے کتاب الشرکہ میں اس قسم کے اشتراک کو ''نہد'' قرار دیا ہے، اور عہدِ رسالت میں اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''لم یر المسلمون فی النهد بأسا، أن یأکل هٰذا بعضا وهذا بعضا.

(صحیح البخاری، کتاب الشرکة ج:۱ ص:۳۳۷)

اس کے تحت حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''انها لیس من باب المعاوضات التی تجری فیه المماکسة أو تدخل تحت الحکم وانما هی من باب التسامح والتعامل، وکیف تکون خلاف الاجماع مع انه قد جری به التعامل من لدن عهد النبوة الٰی یومنا هٰذا.

(فیض الباری ج:۳ ص:۳۴۲)[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹/۲۷)

---

(۱) طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه.

وفی عمدة القاری شرح البخاری ج:۱۳ ص:۶۰ (طبع دار احیاء التراث) باب الشرکة فی الطعام والنهد والعروض وکیف قسمة ما یکال ویوزن مجازفة أو قبضة قبضة لما لم یر المسلمون فی النهد بأسا أن یأکل هٰذا بعضا وهٰذا بعضا وکذٰلک مجازفة الذهب والفضة والقران فی التمر أی هٰذا باب فی بیان حکم الشرکة فی الطعام وقد عقد لهٰذا باب مفردا مستقلا یأتی بعد أبواب اِن شاء الله تعالٰی قوله والنهد بفتح النون وکسرها وسکون الهاء وبدال مهملة قال الأزهری فی التهذیب النهد اِخراج القوم نفقاتهم علٰی قدر عدد الرفقة یقال تناهدوا وقد ناهد بعضهم بعضا وفی المحکم النهد العون وطرح نهده مع القوم أعانهم وخارجهم وقد تناهدوا أی تخارجوا یکون ذٰلک فی الطعام والشراب وقیل النهد اِخراج الرفقاء النفقة فی السفر وخلطها ویسمی بالمخارجة وذٰلک جائز فی جنس واحد وفی الأجناس واِن تفاوتوا فی الأکل ولیس هٰذا من الربا فی شیء واِنما هو من باب الاباحة.

وفیه أیضًا ج:۱۳ ص:۶۱ (طبع دار احیاء التراث) قوله لما لم یر المسلمون اللام فیه مکسورة والمیم مخففة هٰذا تعلیل لعدم جواز قسمة الذهب بالذهب والفضة بالفضة مجازفة أی لأجل عدم رؤیة المسلمین بالنهد بأسا جوزوا مجازفة الذهب بالفضة لاختلاف الجنس بخلاف مجازفة الذهب بالذهب والفضة بالفضة لجریان الربا فیه فکما ان مبنی النهد علی الاباحة واِن حصل التفاوت فی الأکل فکذٰلک مجازفة الذهب بالفضة وان کان فیه التفاوت بخلاف الذهب بالذهب والفضة بالفضة لما ذکرنا قوله أن یأکل هٰذا بعضا تقدیره بأن یأکل وأشار به الٰی أنهم کما جوزوا النهد الذی فیه التفاوت فکذٰلک جوزوا مجازفة الذهب والفضة مع التفاوت لما ذکرنا قوله والقران فی التمر بالجر ویروی والاقران عطف علٰی قوله أن یأکل هٰذا بعضا أی بأن یأکل هٰذا تمرتین تمرتین وهٰذا تمرة تمرة.

وفیه أیضًا ج:۱۳ ص:۶۲ (طبع دار احیاء التراث) مطابقته للترجمة تؤخذ من قوله فأمر أبو عبیدة بأزواد ذٰلک الجیش فجمع ذٰلک کله ولما کان یفرق علیهم کل یوم قلیلًا قلیلًا صار فی معنی النهد واعترض بأنه لیس فیه ذکر المجازفة لأنهم لم یریدوا المبایعة ولا البدل وأجیب بأن حقوقهم تساوت فیه بعد جمعه فتناولوه مجازفة کما جرت العادة.

......................(باقی اگلے صفحے پر)

کیا شرکت یا مضاربت میں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس لی جاسکتی ہے؟

(الائنس موٹرز کمپنی میں جمع کرائی ہوئی رقم واپس لوٹانے کی شرط کا حکم)

وضاحت:- سائل نے پہلے یہ سوال دارالافتاء والارشاد میں بھیجا اور وہاں سے جواب حاصل کر کے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا، سوال اور دارالافتاء والارشاد کی جانب سے اس کا جواب اور پھر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب درج ذیل ہے۔ (محمد زبیر)

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ الائنس موٹرز کے نام سے آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ یہ ایک پرائیویٹ کمپنی ہے، جس میں لوگ اپنا سرمایہ بھی لگاتے ہیں، اور کمپنی کی جانب سے انہیں ہر ماہ حاصل شدہ منافع کا چالیس فیصد حصہ دیا جاتا ہے۔ میں کمپنی کا مقرر کردہ نمائندہ ہوں، اور کمپنی کے اُصول کے مطابق لوگوں سے سرمایہ وصول کر کے کمپنی پہنچا دیتا ہوں۔ کمپنی کے اُصولوں میں سے ایک اُصول یہ بھی ہے کہ سرمایہ کار اگر اپنی جمع شدہ رقم کمپنی سے نکلوانا چاہے تو اُسے ایک ماہ پیشگی نوٹس دینا ہوتا ہے، جس کا منافع یعنی اس ماہ کا منافع سرمایہ کار کو نہیں ملتا۔

اب زید ایک سرمایہ کار نے اپنی رقم کمپنی سے نکلوانے کے لئے فرض کریں یکم جنوری کو نوٹس دیا، لہٰذا یکم فروری کو زید کی رقم لوٹادی جاتی ہے، جبکہ ماہِ جنوری کا منافع زید کو نہیں دیا گیا (کمپنی کے اُصول کے مطابق جس کا سرمایہ کار کو علم ہے)، خیال رہے کہ یکم فروری کو بکر کمپنی میں سرمایہ کاری کی غرض سے اتنی ہی رقم لے کر آئے تھے جتنی زید کو مطلوب تھی، لہٰذا یہی رقم زید کو لے کر دی گئی تھی، اور زید کی رقم بکر کی رقم شمار کی گئی، اب سوال یہ ہے کہ ماہِ جنوری کے منافع کا حق دار کون ہے؟ کمپنی کے اُصول کے مطابق یہ رقم مجھے دی گئی ہے، آیا میں اس کا حق دار ہوں یا نہیں؟

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)......... وفی فتح الباری، کتاب الشرکۃ ج:۵ ص:۱۷۰، ۱۷۱ (طبع مکتبۃ الرشد) وأما بفتحها فجميع أصناف المال وما عدا النقد يدخل فيه الطعام فهو من الخاص بعد العام ويدخل فيه الربويات ولكنه اغتفر فى النهد لثبوت الدليل على جوازه واختلف العلماء فى صحة الشركة كما سيأتى قوله وكيف قسمة ما يكال ويوزن أى هل يجوز قسمته مجازفة أو لا بد من الكيل فى المكيل والوزن فى الموزون وأشار الى ذلك بقوله مجازفة أو قبضة قبضة أى متساوية قوله لما لم تر المسلمون بالنهد بأسا هو بكسر اللام وتخفيف الميم وكأنه أشار الى أحاديث الباب وقد ورد الترغيب فى ذلك وروى أبو عبيد فى الغريب عن الحسن قال أخرجوا نهدكم فانه أعظم للبركة وأحسن لأخلاقكم قوله وكذلك مجازفة الذهب والفضة كأنه ألحق النقد بالعرض للجامع بينهما وهو المالية لكن انما يتم ذلك فى قسمة الذهب مع الفضة أما قسمة أحدهما خاصة حيث يقع الاشتراك فى الاستحقاق فلا يجوز اجماعًا قاله بن بطال وقال بن المنير شرط مالك فى منعه أن يكون مصكوكًا والتعامل فيه بالعدد فعلى هذا يجوز بيع ما عداه جزافا ومقتضى الأصول منعه وظاهر كلام البخارى جوازه ويمكن أن يحتج له بحديث جابر فى مال البحرين والجواب عن ذلك أن قسمة العطاء ليست على حقيقة القسمة لأنه غير مملوك للآخذين قبل التمييز والله أعلم.

(جواب از دارالافتاء والارشاد ناظم آباد، کراچی)

جواب:- دراصل جس تاریخ کو نوٹس دیا جاتا ہے اس تاریخ میں سرمایہ کار کے حصص کمپنی خرید لیتی ہے، اور اس کے ثمن کی ادائیگی ایک ماہ بعد ہوتی ہے، لہٰذا وہ رقم آپ کے لئے حلال ہے۔

واللہ اعلم

محمد موسیٰ

دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

فتویٰ نمبر ۲۲۸۹۵

الجواب صحیح

عبدالرحیم

نائب مفتی دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

شرکت یا مضاربت میں رقم لوٹانے کا سوال نہیں ہوتا، اور اس کی جو توجیہ دارالافتاء والارشاد کے مذکورہ جواب میں ذکر کی گئی ہے وہ دُرست ہوسکتی ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ یا تو رقم لگانے والے کو یہ اِختیار ہو کہ وہ اپنا حصہ جسے چاہے فروخت کردے، یا پھر حصے کی قیمت پہلے سے اتنی مقرّر نہ کی جائے جو اَصل لگائی ہوئی رقم کے برابر ہو، کیونکہ اس صورت میں رأس المال مضمون ہوجائے گا جو شرکت اور مضاربت دونوں میں جائز نہیں ہے، اس کے بجائے یا تو خریداری کے وقت اثاثوں کی بازاری قیمت پر خریدے، یا باہمی رضامندی سے کوئی قیمت وقت پر مقرّر کرلی جائے۔ اگر اس معاہدے میں یہ بات ہے تب تو دُرست ہے لیکن اگر ہر صورت میں اصل لگائی ہوئی رقم پر بیچنے کی شرط ہے تو اس سے رأس المال کے مضمون ہونے کی بنا پر یہ شرط فاسد ہوگی،(۱) البتہ مضاربت شرطِ فاسد سے فاسد نہیں

---

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں اس شرط (یعنی اپنی لگائی ہوئی مکمل رقم واپس نکلوانے کی شرط) کا حاصل یہ ہوگا کہ نقصان برداشت نہ کرنے کی شرط لگائی گئی ہے، اور یہ شرط فاسد ہے۔

وفی مجمع الأنهر، کتاب المضاربة ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع مکتبه غفاریه کوئٹه) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة هی الخسران علی المضارب لأنّ الخسران جزء هالک من المال فلا یجوز أن یلزم غیر ربّ المال لٰکنه شرط زائدٌ یوجبُ قطع الشرکة فی الربح.

وفی الفتاویٰ التاتارخانیة کتابُ الشرکة الفصل الرابع فی العنان ج:۵ ص:۶۵۵ (طبع ادارة القرآن کراچی) وان شرطا أن یکون الرّبح والوضیعة بینهما نصفین فشرط الوضیعة بصفة فاسد ولٰکن بهٰذا لا تبطل الشرکة لأنّ الشرکة لا تبطل بالشروط الفاسدة وان وضعا فالوضیعة علیٰ قدر رأس مالهما.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) کل شرط یوجب جهالة فی الرّبح أو یقطع الشرکة فیه یفسدها والّا بطل الشرط. وفی الشامیة تحته (قوله بطل الشرط) کشرط الخُسران علی المضارب.

وفی المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی ج:۶ ص:۴۰۱ (طبع غفاریه کوئٹه) وان شرط الوضیعة والرّبح نصفان فشرط الوضیعة نصفان فاسد لأنّ الوضیعة هلاک جزء من المال فکأن صاحب الألفین شرط ضمان شیء ممّا هلک من ماله علیٰ صاحبه وشرط الضمان علی الآخر فاسد ولٰکن بهٰذا لا تبطل الشرکة حتّی لو عملا وربحا فالرّبح بینهما علیٰ ما شرطا.

وفی تبیین الحقائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة علی المضارب. وکذا فی شرح المجلّة ج:۲ ص:۷۵۷ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه).

ہوتی،[1] لہٰذا مضاربت کا عقد اس کے باوجود دُرست ہے،[2] ہاں خلافِ شرع شرط لگانے کا گناہ ہوگا اور یہ شرط واجب التعمیل نہ ہوگی۔[3] چنانچہ اس کاروبار سے جو منافع تقسیم کیا گیا، اگر اس میں کوئی اور خلافِ شرع اَمر نہ ہو تو اس کا استعمال بھی جائز ہے۔ رہی یہ بات کہ مہینے کے شروع میں بکر نے جو رقم لگائی، وہی زید کو دے دی گئی، سو اس سے مسئلے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس کی وجہ سے بکر جنوری کے نفع کا مستحق نہیں ہوا، کیونکہ بکر کے دیتے ہی وہ رقم مالِ مضاربت میں شامل ہوگئی، اور نقود متعین نہیں ہوتے، لہٰذا چاہے وہ رقم زید کو دے دی گئی ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ زید کو اس کے حصے کی قیمت دی گئی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۸/۱۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸۸/۳۹ ز)

والد کی طرف سے شروع کرائے ہوئے کاروبار میں والد کو بیٹوں کے حصے مقرّر کرنے اور ان میں کمی بیشی کا اِختیار ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین بیچ اس مسئلے کے: زید کے والد عبداللہ کے چار لڑکے: زید، حارث، بکر، خالد۔ زید اپنے والد کے ساتھ دُکان پر کام کرتا ہے، زید کو اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے جب تقریباً گیارہ سال کا عرصہ ہوا تو زید نے اپنی کوشش سے ایک دُکان کرایہ پر لی اور باپ نے الگ دُکان پر کام شروع کیا، اور اللہ کے حکم سے ایک اور کاروبار شروع کیا، یہ کاروبار رات کو شروع ہوتا ہے ٹرانسپورٹ کا، رات آٹھ بجے دُکان بند کر کے گیرج پر بسوں کی مرمت وغیرہ کا کام، تقریباً تین سال بعد یہ کام بند کردیا کیونکہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہوا، اس دوران زید کی شادی ہوئی، شادی کے بھی نو ماہ بعد اتفاق سے کچھ قانونی کام کے لئے والد صاحب کی دُکان پر اور زید کی دُکان پر پارٹنرز بنانے کا سوال آیا، والد صاحب کی دُکان پر چاروں بھائی کے چار چار آنے حصہ مقرّر ہوا، زید کی

(۱ تا ۳) وفی ردّ المحتار، کتاب الشرکۃ ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع سعید) .... لأنّ الشرکۃ لا تفسد بالشروط الفاسدۃ.
وکذا فی فتح القدیر، کتاب الشرکۃ، فصل ولا تنعقد الشرکۃ ج:۶ ص:۱۷۷ (طبع مصطفیٰ بابی مصر)
وفی المحیط البرھانی فی الفقہ النعمانی ج:۶ ص:۴۰۲ (طبع غفاریہ کوئٹہ) فالشرکۃ ممّا لا تبطل بالشروط الفاسدۃ .... الخ. وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) .... بطل الشرط وصحّ العقد وفی الشامیۃ تحتہ کشرط الخُسران علی المضارب .... الخ.
وفی مجمع الأنھر ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریہ کوئٹہ) .... شرطٌ زائد .... فلا یفسد المضاربۃ لأنّھا لا تفسد بالشروط الفاسدۃ کالوکالۃ .... الخ. وکذا فی الدر المنتقیٰ علیٰ مجمع الأنھر ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریہ) وفی الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج:۵ ص:۶۵۵ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) ان الشرکۃ لا تبطل بالشروط الفاسدۃ. (محمد زبیر حق نواز)۔

دُکان پر زید کے سات آنے، بکر، حارث، خالد کے تین تین آنے طے ہوئے، کیونکہ زید کو والد نے کام کے لئے روپے دیئے تھے، اور زید نے رات دن محنت کی تھی، زید رات دو تین بجے روز سوتا تھا، باپ نے زید کو تقریباً اٹھارہ ہزار روپے دیئے تھے، دُکان کر کے زید نے چھ سات سال بعد دُکان بھی خریدی، ۱۹۷۵ء میں والد صاحب حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، جانے سے پہلے وصیت نامہ تحریر کیا، تحریر کرتے وقت خود اپنی دُکان میں حسبِ سابق زید، بکر، حارث، خالد کو چار چار آنے کا حصہ دار مقرّر کیا، اور بعد میں فرمایا کہ زید کی دُکان میں سب کو چار چار آنے دیا جائے، زید نے والد صاحب کو یاددہانی کرائی کہ آپ نے پہلے زید کی دُکان میں زید کو سات آنے اور حارث کو تین آنے، بکر کو تین آنے، خالد کو تین آنے تحریر کئے ہیں، زید کے احتجاج پر والد صاحب نے زید کو سات آنے کا حصہ دار تسلیم کیا، زید کی دُکان میں حج سے آنے کے بعد ایک بار پھر پارٹنرز بنانے کا نیا معاہدہ تحریر کرنا پڑا تو والد صاحب نے فرمایا کہ زید کے لئے سات آنے کے بجائے چار آنے مقرّر کیا جائے، زید نے اپنے والد کو یاددہانی کرائی اور اپنی والدہ کو سب حالات سے آگاہ کیا، والدہ نے کہا کہ وہ والد سے بات کریں گی، والدہ نے بات چیت کے بعد کہا کہ میں نے تمہارے والد کو اس بات پر راضی کیا ہے کہ تم چھ آنے لے لو، زید نے کہا دو بار تحریر کرنے کے بعد چھ آنے کی کیا وجہ ہے؟ مجھ کو سات آنے دیا جائے، چھ آنے سات آنے کے مسئلے پر ایک یا ڈیڑھ سال یہ بات تفصیل میں رہی، ایک بار پھر چھ آنے سات آنے پر بات ہوئی تو والد صاحب چھ آنے کو چھوڑ کر فرمانے لگے کہ زید کو زید کی دُکان میں چار آنے دیئے جائیں۔ زید نے اپنی والدہ کو پھر آگاہ کیا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ والد صاحب چھ آنے دینا چاہتے ہیں، لیکن وہ تو پھر چار آنے کی بات کر رہے ہیں، والدہ نے کہا کہ وہ پھر بات کریں گی، والدہ نے آٹھ روز بعد جواب دیا کہ میں نے بات کی چھ آنے تم کو دیئے جائیں گے، میں نے والدہ سے کہا کہ آپ والد صاحب سے کہیں کہ سات آنے کر دیا جائے اور کچھ تجاویز بھی میری طرف سے پیش کریں، ۱- تجویز اگر آپ زید کو زید کی دُکان میں سات آنے نہیں دینا چاہتے تو آج تک حساب کر کے زید کو زید کی دُکان سے تین آنے دے دیں، آئندہ زید کو زید کی دُکان میں سب کے برابر دیا جائے، زید کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، حالانکہ زید کسی بھائی کو کچھ بھی نہ دینا چاہے تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا، دُکان زید نے خریدی، زید کے نام پر ہے، تمام کاروبار زید کے نام پر ہے، لیکن زید اپنے وعدے سے نہیں پھرنا چاہتا، والد صاحب سے والدہ نے جو آٹھ روز پہلے بات کی تھی کہ زید کو چھ آنے دے دیا جائے اس بات کے بعد پھر اچانک فرمایا: نہیں! زید کو چار آنے دیا جائے، وجہ یہ بیان فرمائی کہ اگر زید کو سات آنے دے دُوں تو حارث، بکر، خالد کے ساتھ بے ایمانی ہوگی۔ زید والد سے یہ تو نہیں کہتا کہ آپ اپنی دُکان میں سات

آنے دیں، زید تو صرف اپنی کمائی ہوئی رقم سے سات آنے چاہتا ہے، جو والد کے وعدے کے عین مطابق ہے، یہ وعدہ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں کیا تھا اور پھر ۱۹۷۵ء میں تجدید کرلی۔ از راہِ کرم شریعت کی رُو سے ایسا کرنے پر والد صاحب کیا بے ایمانی کے مرتکب ہوتے ہیں؟ یا زید کو اس کا حق دیتے ہیں؟ زید کے بھائی حارث عمر ۲۷ سال نے صرف ڈیڑھ یا دو سال کام کیا، بکر نے آٹھ سال یا نو سال کام کیا، عمر ۲۰ سال، خالد نے ساڑھے تین سال کام کیا، عمر ۱۸ سال۔ زید عمر ۳۳ سال، بائیس سال کام کیا، ایک لڑکی، دو لڑکے، ۶ سال، ۵ سال، ۴ سال۔ زید عمر کا ایک بڑا حصہ والد صاحب کے ساتھ گزار چکا ہے، وہ کسی کام کی بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا، اس لئے آپ کو یہ مسئلہ تحریر کر رہا ہے تاکہ وہ حق کی رہنمائی حاصل کرسکے اور کوئی بات غلط ہو تو اپنی غلطی دُور کرلے ورنہ یہ فتویٰ اپنے والد کے رُوبرو پیش کرکے فیصلہ ان پر چھوڑ دے، زید کی معلومات کے مطابق اسلام وعدے کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے۔

جواب:- اگر زید کے والد نے زید کو تجارت کے لئے رقم دیتے وقت یہ طے کیا تھا کہ کاروبار میں سات آنے زید کے اور تین تین آنے باقی بھائیوں کے ہوں گے، تو اس پر اس طے شدہ معاہدے کی پابندی لازم ہے،[1] اور اس کی خلاف ورزی ہرگز جائز نہیں۔[2]

البتہ سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں زید کی دُکان پر زید تنہا کام کرتا تھا، اس کے بعد دُوسرے بھائی بھی کام میں شریک ہوتے گئے، اگر صورتِ حال یہی ہے تو سات آنے والے معاہدے کی پابندی اسی وقت تک لازم ہے جب تک زید تنہا کام کرتا رہا، اور جس تاریخ سے دُوسرا کوئی بھائی کام میں شریک ہوا اس تاریخ سے باپ کو نیا معاہدہ کرنے کا حق حاصل ہے،[3] جس میں زید کا حصہ کم کرکے دُوسرے کام کرنے والے بھائیوں کا حصہ زیادہ بھی کرسکتا ہے۔[4] اور اگر شروع ہی سے تمام بھائی کام میں شریک تھے، یا اس وقت سے شریک تھے جب سے سات آنے کا معاہدہ ہوا تو سوال لکھ کر اس صورت کا مسئلہ دوبارہ پوچھ لیا جائے، اس صورت میں یہ کاغذ بھی ساتھ ضرور روانہ کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۷۰۹ د)

(۱ تا ۴) کیونکہ ایسی صورت میں یہ سارا کاروبار زید کے والد کی ملکیت ہوگا، اور زید کے والد نے زید اور اس کے بھائیوں کے لئے جتنا حصہ مقرر کیا ہو، وہ اُتنے ہی حصے کے حق دار ہوں گے۔

وفی الشامیة ج:۴ ص:۳۲۵ (طبع سعید) لما فی القنیة الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کلّه للأب ان کان الابن فی عیاله لکونه معینًا لهٗ ..... الخ.

وفی الهندیة کتاب الشرکة الباب الرّابع فی شرکة الوجوه وشرکة الأعمال ج:۲ ص:۳۲۹ (طبع رشیدیه) أب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة لم یکن لهما مال فالکسب کلّه للأب اذا کان الابن فی عیال الأب لکونه معینًا لهٗ، الا تریٰ انّه لو غرس شجرةً تکون للأب ..... الخ. ....

(باقی اگلے صفحے پر)

شرکت میں فریقین کے لئے علیحدہ علیحدہ مال متعین کر کے اس پر نفع نقصان حاصل کرنے کی مخصوص صورت کا حکم

سوال:- ایک شخص نے چار گنا رقم دُوسرے شخص سے زیادہ ایک کاروبار میں ڈالی اور کاروبار کی صورت یہ رکھی کہ وہ پہلا شخص جس کی چار گُنا رقم ہے دُوسرے شخص کو مال خرید کر دیتا ہے اور دُوسرے شخص کی رقم پہلے شخص سے چوتھائی ہے، اور جب مال خرید کر دُوسرے شخص کو دیتا ہے تو اس پر پانچ فیصد کے حساب سے نفع لگاتا ہے اور اس کے بعد نفع پہلے اور دُوسرے شخص کو تقسیم کیا جاتا ہے کہ پہلے شخص کو تین فیصد اور دُوسرے شخص کو دو فیصد نفع اس مال کی مالیت سے ملتا ہے، اور اس صورت میں سے شخص بَری ہو جاتا ہے کہ دُوسرے شخص کو مال میں سے نفع ہو یا نقصان، پھر دُوسرا شخص مال اِکٹھا کر کے پہلے شخص کو دیتا ہے اور وہ مال لاتا ہے اور پھر وہ اس طریقے سے نفع لگاتا ہے اور نفع دونوں میں تقسیم ہوتا ہے، کیا یہ کاروبار از رُوئے شریعت دُرست ہے؟

جواب:- سوال مجمل ہے، غور کرنے سے معاملے کی صورت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ''الف'' اور ''ب'' میں شرکت کا معاملہ ہے، اصل سرمائے میں چار حصے ''الف'' نے اور ایک حصہ ''ب'' نے لگایا ہے، اس مجموعی سرمائے سے جو سامانِ تجارت خریدا گیا، اسے فروخت کرنے سے قبل دونوں نے اندازہ کرلیا کہ اس پر پانچ فیصد نفع ہوگا، اور پھر اس کو فروخت سے پہلے ہی اس طرح تقسیم کرلیا کہ تین حصے ''الف'' کے اور دو حصے ''ب'' کے قرار پائے۔ ''الف'' نے اپنے تین حصے وصول کر کے سامان فروخت کے لئے ''ب'' کے حوالے کر دیا کہ اگر نفع زیادہ ہو تو بھی اس کا ہے، اور نقصان ہو تو بھی اس پر ہے۔ اگر معاملے کی صورت یہی ہے جو اُوپر لکھی گئی تو یہ صورت ناجائز ہے،[1] اس لئے کہ اس میں ''الف'' کا تین فیصد نفع معین ہے اور ''ب'' کا نفع مشتبہ ہے،[2] معاملہ اس طرح کرنا چاہئے کہ نفع کا فروختگی سے پہلے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) .... وفی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة کتاب الشرکة ج:۱ ص:۹۵ (طبع میمنیة مصر) أب وابن اکتسبا ولم یکن لکھا مال فاجتمع لھما من الکسب أموال فالکل للأب لأنّ الابن اذا کان فی عیاله فھو معین لهٗ الا تریٰ انّه لو غرس شجرةً فھی للأب .... الخ.

وفی الفتاویٰ الکاملیة کتاب الشرکة ص:۵۱ (طبع رشیدیه) اذا کان الولد فی عیال أبیه ومعینًا لهٗ یکون جمیع ما تحصل من الکسب لأبیه .... الخ.

وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۱۳۹۸ ج:۱ ص:۷۴۱ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه) اذا عمل رجل فی صنعة هو وابنه الّذی فی عیاله فجمیع الکسب لذٰلک الرّجل وولده یُعدّ معینًا لهٗ وکذا اذا اعانهٗ ولده الّذی فی عیاله عند غرسه شجرةً فتلک الشجرة للأب لا یشارکه ولده فیھا .... الخ. (وکذا فیه شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۳۱۹ طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه). (محمد زبیر حق نواز)

(۱و۲) تفصیلی حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۴۲ و ۴۸ اور اگلے صفحے کے حواشی۔

اندازہ کرنے کے بجائے مثلاً یہ طے کرلیا جائے کہ اس سامان کو فروخت کر کے اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس کا ایک چوتھائی ''ب'' کا اور تین چوتھائی ''الف'' کا ہوگا۔[1] باہمی رضامندی سے نفع کا کوئی اور تناسب بھی طے کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ تناسب نفع کا ہونا چاہئے، اصل مال کا نہیں۔[2] اور اگر معاملے کی صورت کچھ اور ہے تو کسی عالم کو سمجھا کر اس سے دوبارہ سوال لکھوائیں اور بھیج دیں، اس کا جواب دے دیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۸/۲۲ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مضاربت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے پر ہوگا، جبکہ شرکت (پارٹنرشپ) میں ہر فریق کو اپنے سرمائے کے بقدر نقصان برداشت کرنا ہوگا

سوال:- "Sleeping Partner" کے طور پر کسی کاروبار میں اس شرط کے ساتھ پیسہ لگانا کہ جو نفع ونقصان بھی ہوگا ایک متعین فیصد Sleeping Partner کے حصے میں آئے گا، مثلاً ۲۵ فیصد نفع اور نقصان دونوں میں۔ اس میں بھی دو ذیلی امکان موجود ہوں: ۱-Active Partner صرف محنت کر رہا ہے، اس کا سرمایہ شاملِ تجارت نہیں ہے، ۲-Active Partner نے محنت کے علاوہ سرمایہ بھی لگایا ہوا ہے۔

جواب:- اگر کام کرنے والا صرف محنت کر رہا ہے، اس کا کوئی سرمایہ شامل نہیں ہے، تو اس

(۱ و ۲) وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة:۱۳۳۷ ج:۲ ص:۷۱۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) يشترط أن تكون حصص الرّبح الّتی تنقسم بين الشركاء جزءًا شائعًا كالنصف والثلث والرّبع فاذا اتفق الشركاء علىٰ اعطاء أحدهم قدرًا معيّنًا كانت الشركة باطلة. وكذا فی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۲۶۰ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه) وكذا فی البحر الرّائق ج:۵ ص:۱۷۷ (طبع سعيد) وخلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۹۴ (طبع امجد اكيڈمی، لاهور).

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ (طبع سعيد) ومنها أن يكون الرّبح معلوم القدر .... ومنها أن يكون الرّبح جزءًا شائعًا فی الجملة لا معيّنًا فان عيّنا عشرة أو مائة أو نحو ذٰلک كانت الشركة فاسدة لأنّ العقد يقتضی تحقق الشركة فی الرّبح والتعيين يقطع الشركة لجواز أن لا يحصل من الرّبح الّا القدر المعين لأحدهما فلا يتحقق الشركة فی الرّبح ....الخ. وفی الهداية ج:۳ ص:۲۶۳ (طبع مكتبه رحمانيه) ومن شرطها أن يكون الرّبح بينهما مشاعًا لا يستحق أحدهما دراهم مسمّاة من الرّبح ..... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

صورت میں نقصان کی کوئی ذمہ داری اس پر ڈالنا شرعاً جائز نہیں، (۱) معاملے کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ نفع کا کوئی فیصد حصہ دونوں کے لئے متعین کیا جائے، اور یہ طے کیا جائے کہ نقصان کی صورت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے کا ہوگا۔ (۲)

اور اگر کام کرنے والے نے محنت کے علاوہ کچھ سرمایہ بھی لگایا ہے تو دونوں کے درمیان نفع کا تناسب باہمی رضامندی سے طے ہوسکتا ہے، (۳) لیکن نقصان کی صورت میں دونوں اپنے اپنے لگائے ہوئے سرمائے کے تناسب سے اُسے برداشت کریں گے، (۴) مثلاً کام کرنے والے نے کل سرمائے کا دس فیصد اپنے پاس سے لگایا ہو، اور نوّے فیصد دُوسرے فریق نے لگایا ہو تو نقصان کی صورت میں پہلا فریق دس فیصد اور دُوسرا فریق نوّے فیصد کا ذمہ دار ہوگا۔ (۵)

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

(۱ و ۲) وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار، کتاب المضاربة ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) کل شرط یوجب جهالة فی الرّبح أو یقطع الشرکة فیه یفسدها والّا بطل الشرط وصحّ العقد.

وفی الشامیة (قوله بطل الشرط) کشرط الخُسران علی المضارب .... الخ.

وفی مجمع الأنهر، کتاب المضاربة ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریه کوئٹه) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة أی الخُسران علی المضارب لأنّ الخُسران جزءٌ هالکٌ من المال فلا یجوز أن یلزم غیر ربّ المال لٰکنه شرط زائد لا یوجب قطع الشرکة فی الرّبح ولا الجهالة فیه فلا یفسد المضاربة لأنّها لا تفسد بالشروط الفاسدة .... الخ.

وفی تبیین الحقائق، کتاب المضاربة ج:۵ ص:۵۲۱ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة علی المضارب .... وشرط الوضیعة شرطٌ زائدٌ لا یوجب قطع الشرکة فی الرّبح ولا الجهالة فیه فلا یکون مفسدًا وتکون الوضیعة وهو الخُسران علی ربّ المال لأنّه ما فات جزءٌ من المال بالهلاک یلزم صاحب المال دون غیره. وکذا فی شرح المجلّة ج:۲ ص:۷۵۷ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه).

نیز دیکھئے ص:۴۲ وص:۴۸ کے حواشی۔

(۳ تا ۵) وفی مصنَّف عبدالرّزّاق ومصنَّف ابن أبی شیبة: ''عن علی رضی الله عنه: الوضیعة علی المال والرّبح علیٰ ما اصطلحوا علیه'' (کنز العمّال ج:۱۵ ص:۱۷۶ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲).

وفی موسوعة الاجماع: اتفقوا علیٰ أنّ الرّبح والخُسران فی الشرکة بین الشرکاء کل بقدر ماله.

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۲ (طبع سعید) والوضیعة علیٰ قدر المالین متساویًا ومتفاضلًا لأنّ الوضیعة اسم لجزء هالک من المال فیتقدر بقدر المال.

وکذا فی فتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۷ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

وفی المدوّنة الکبریٰ للامام مالکؒ ج:۳ ص:۶۰۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) الوضیعة عند مالک علیهما علی قدر رؤس أموالهما.

وفی المجموع شرح المهذّب ج:۱۴ ص:۷۱ (طبع دار احیاء التراث بیروت) ویقسم الرّبح والخُسران علیٰ قدر المالین.

وفی المغنی لابن قدامةؒ ج:۵ ص:۲۲ (طبع دار الفکر بیروت) الخسران فی الشرکة علیٰ کل واحد منهما بقدر ماله فان کان مالهما متساویًا فی القدر فالخُسران بینهما نصفین، وان کان اثلاثًا فالوضیعة أثلاثًا لا نعلم فی هٰذا خلافًا بین أهل العلم وبه یقول أبو حنیفة والشافعی وغیرهما .... الخ.

مضارب کا مضاربت کے اختتام پر مالِ مضاربت کو قیمتِ اسمیہ پر خریدنے کی شرط کا حکم

سوال:- فضيلة الدكتور / عبدالستار أبو غدة المحترم[1]

نائب رئيس هيئة الفتوىٰ والرقابة الشرعية ورئيس لجنتها التنفيذية وعضو الهيئة المنتدَب

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته،

تعرض احدى شركات الطاقة الكبرىٰ فى أبوظبى على المصرف ترتيب اصدار صكوك مضاربة لصالحها بالتعاون مع بنك باركليز. والمسألة المتكررة دومًا، ونودُّ أن نعالجها من البداية، هى مسألة الثمن الذى يتعهد المضارب بشراء اصول المضاربة به، وما يجرى عليه العمل - للأسف فى معظم الصكوك - من اعتماد القيمة الاسمية مع المبالغ المتحققة وغير الموزعة من الأرباح. فهل يمكن للخروج من الاشكال الشرعى، أن نمسك العصا من الوسط، ونعالج الأمر على النحو الآتى:-

أوّلًا:- يذكر فى اجراءات الاسترداد أنها تتم بإنهاء المضاربة باستخدام حامل الصك اشعارًا معينًا، ومن ثم يشترى المضارب اصول المضاربة منه.

ثانيًا:- ينصُّ فى التعهد بالشراء بأن المضارب يتعهد بأن يشترى أصول المضاربة بالقيمة الاسمية ويكون هٰذا التعهد مضافًا الىٰ ما بعد انتهاء أو انهاء المضاربة بالنحو المتقدِّم.

وبهٰذه الكيفية يكون تعهد المضارب مضافًا الى الوقت الذى لا يكون (لا يبقىٰ) فيه مضاربًا.

هٰذه هى المعالجة المقترحة بشكل مجمل، فهل ترونها مقبولة؟

وتقبلوا فائق الاحترام والتقدير.

محبكم
أسيد كيلانى

جواب:- الىٰ فضيلة الشيخ أسيد كيلانى، حفظه الله تعالىٰ

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فان تعهد المضارب بشراء الأصول بالقيمة الاسميّة لا يجوز،[2] ولو كان بعد انتهاء

---

(۱) سائل نے شیخ عبدالستار ابوغدہ کی طرف یہ استفتاء بھیجا تھا انہوں نے جواب کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۷ اور ص:۴۷ کے فتاویٰ اوران کے حواشی۔

المضاربة، ما دام هٰذا التعهد موجودًا عند عقد المضاربة، بمعنى أنه يوقّع عند ابرام عقد المضاربة، سواء كان منصوصًا فى عقد المضاربة أو منفصلًا عنه. والله سبحانه أعلم

أخوكم
محمد تقى العثمانى عفا الله عنه
۷رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

شرکتِ متناقصہ میں بینک کو قیمت کی ادائیگی سے قبل قلبِ دَین کی ایک مخصوص صورت کا حکم

(اسلامی بینک بنگلہ دیش کے ایک سوال کا جواب)

سوال:- فضيلة الشيخ / الأستاذ محمد تقى عثمانى حيّاه الله تعالىٰ

نائب رئيس دار العلوم كراتشى، باكستان،
وعضو مجمع الفقه الاسلامى التابع لمنظمة المؤتمر الاسلامى

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد:

فيسرنا أن نتقدم لفضيلتكم بأطيب التحيات وأخلص التقديرات متمنين لكم دوام الصحة والعافية، وبعد، فنرجو من فضيلتكم التكرم بابداء الرأى الشرعى فى الصورة التالية:

ان أحد عملاء البنك الاسلامى يتمتع بتسهيلات استثمارية تحت صيغة بيع المرابحة للآمر بالشراء بمبلغ قدره ٣٥ مليون تاكا، وكان يتعامل مع البنك بصفة مرضية حيث كان يشترى من البنك بضائعه المطلوبة مرابحة بالأجل فى حدود المبلغ أعلاه فيبيعها فى السوق فيسدد بقيمتها دينه المترتب عليه للبنك، قبل حلول الأجل. لٰكنه فى الآونة الأخيرة اشترى سيارات وشاحنات عددها ٢٦ بقيمة البضائع المباعة دون أن يسدد بها دينه المترتب عليه بغير اذن مسبق من البنك. والجدير بالذكر أن الأجل لتسديد الدين المترتب عليه لم يحل الى الآن. وفى هٰذا الوضع اقترح العميل للبنك اقتراحًا جديدًا من توقيع عقد جديد عقد اجازة بالبيع تحت شركة الملك حيث يشارك البنك مع العميل فى ملكية السيارات والشاحنات المذكورة بمقابل ١٠ مليون تاكا من دين المرابحة الذى يستحقه البنك فبذٰلك يتخلص العميل من دين المرابحة بقدر ١٠ مليون تاكا الذى كان عليه تسديده للبنك فيكون البنك مالكًا (أى شريكًا) للسيارات والشاحنات المذكورة أعلاه ويؤجرها للعميل ويدفع العميل للبنك أجرة معينة علىٰ أقساط كما أنه يشتريها من البنك تدريجيًا بدفع قيمتها علىٰ أقساط معينة. فهل يجوز للبنك أن يوافق علىٰ اقتراح العميل فى الصورة الموضحة أعلاه؟

شاكرين لكم حسن تعاونكم معنا، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

مع أطيب التقديرات

محمد سراج الاسلام

عضو وأمين اضافى هيئة الرقابة الشرعية

بنک بنغلاديش الاسلامى المحدود

جواب:- حيث ان المعاملة المقترحة تكون شركة متناقصة، ويراعى فى مبلغ الأجرة ربح للبنک فوق أجرة المثل، فان هٰذه المعاملة تكون من قبيل قلب الدَّين، فلا تجوز، أمّا اذا كانت أجرة السيارات أجرة المثل وكان شراء حصص السيارات من قبل العميل علىٰ أساس القيمة السوقية فلا بأس بهٰذه المعاملة، بشرط أن لا تكون عقود البيع والاجارة مشروطًا بعضها ببعض،(۱) بل يكون كل عقد منفصلًا عن الآخر.(۲) والله سبحانه وتعالىٰ أعلم

محمد تقى العثمانى

۴ر شعبان ۱۴۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵/۹۸۹)

(میاں فارم ٹرانسوال افریقہ کی ایک فیملی شراکتی کمپنی سے متعلق مختلف سوالات کے جوابات)

(ایک معاہدۂ شرکت کی حیثیت)

۱:- والد کی طرف سے اپنی تجارت و جائیداد چار بیٹوں کو مشترکہ طور پر فروخت کرنے کے ایک معاہدۂ شرکت کا حکم

۲:- معاہدۂ شرکت کی خلاف ورزی کرنے والے شریک کا حکم

۳:- معاہدۂ شرکت میں سرمایۂ تجارت کی مقدار متعین طور پر نہ لکھی ہوئی ہو تو کیا حکم ہے؟

۴:- کسی شریک کے کام نہ کرنے یا غائب ہوجانے سے شرکت ختم ہوجائے گی یا نہیں؟

(۱ و ۲) وفى سنن أبى داوٗد ج:۳ ص:۲۸۳ (طبع رحمانيه) لا يحل سلف وبيع ولا شرطان فى بيع. وكذا فى جامع الترمذى ج:۳ ص:۵۳۵ (طبع سعيد) وفى المعجم الأوسط للطبرانى ج:۴ ص:۳۳۵ ان النبى صلى الله عليه وسلم نهٰى عن بيع شرط. وفى الهداية ج:۳ ص:۶۲ (طبع رحمانيه) لو باع عبدًا علىٰ أن يستخدمه البائع شهرًا أو دارًا على أن يسكنها .... لأنه شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين ولأنه نهٰى عن بيع وسلف ولأنه لو كان الخدمة والسكنٰى يقابلهما شىء من الثمن يكون اجارة فى بيع ولو كان لا يقابلها يكون اعارةً فى بيع وقد نهٰى النبى صلى الله عليه وسلم عن صفقتين فى صفقةٍ. نیز دیکھئے ص:۷۸ کا حاشیہ نمبر۱۔

۵:- یک طرفہ طور پر شرکت کو ختم کرنے کے لئے دُوسرے شرکاء کا فسخ کو قبول کرنا ضروری نہیں

۶:- معاہدے میں کسی شریک کے تحریراً اِستعفاء دینے کے چھ ماہ بعد اُس کی شرکت ختم ہوجانے کے اُصول کی شرعی حیثیت

۷:- کسی شریک کے مستعفی ہوجانے کے چھ ماہ بعد بھی دیگر شرکاء اُس کو حصہ دیتے رہے تو اس کی شرکت باقی ہوگی یا نہیں؟

۸:- فسخِ شرکت کے لئے دیگر شرکاء کو اِطلاع دینا ضروری ہے، محض استعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لینے سے شرکت ختم نہیں ہوگی

۹:- کسی شریک کے انتقال کے بعد اس کی اولاد کاروبار میں شریک ہوگی یا نہیں؟ اور مرحوم شریک کی اولاد کو شریکِ کاروبار بنانے کی مجلس میں بعض شرکاء کے سکوت اِختیار کرنے کا حکم

سوال:- ضروری تمہید مختصراً:-

حاجی موسیٰ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات میں اپنی تمام جائیداد و تجارات کو اپنے چار فرزندوں کو زبانی طور پر فروخت کیا، بعد ازیں ان چار بیٹوں نے ان تجارات و جائیداد کو حاصل کر کے اور اس پر قبضہ پانے کے بعد ایک تجارتی شرکت جاری کی، اس تجارتی شرکت کو باقاعدہ چلانے کی غرض سے انہوں نے ایک معاہدۂ شرکت مرتب کیا، جو آنحضور کی خدمتِ عالی میں مع اِستفتاءِ ھٰذا کے ارسال ہے، اب دریافت طلب اُمور حسبِ ذیل ہیں، قوی اُمید ہے کہ حضرتِ والا توجہ خاص فرما کر جلد از جلد اِستفتاءِ ھٰذا کے جوابات مفصل و مدلل تحریر فرما کر مرہونِ منّت کریں گے، والاجر عند اللہ۔

۱- ملفوف کردہ دستاویز (معاہدہ نامہ)[1] آیا شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

۲- اگر کوئی معاہد اس معاہدے کے خلاف عمل کرے تو ایسی مخالفت از رُوئے شریعت مخالفت ہوگی یا نہیں؟

---

(۱) شراکت کا یہ تفصیلی معاہدہ اس سوال کے آخر میں درج ہے، جس میں اس معاہدۂ شراکت کی تمام جزوی تفصیلات اور دفعات موجود ہیں۔ (محمد زبیر)

۳- اگر معاہدہ نامے میں شرکتِ تجارت کا سرمایہ یعنی اس کی مقدار متعین طور پر مذکور نہ ہو، مگر کسی خاص وجہ سے اس کی متعین مقدار سالانہ گوشوارے میں مذکور ہو تو شرکت معتبر ہوگی یا نہیں؟

۴- اگر کوئی شریک معاہدے کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دے یعنی تجارت میں ذاتی طور پر کام کرنا چھوڑ دے جبکہ تجارت میں ذاتی طور پر کام کرنا معاہدہ نامے میں شرط کے طور پر مذکور ہے، اور پھر کام چھوڑ کر کہیں چلا جائے اور پندرہ سال تک اسی طرح غائب رہے تو شرعاً ایسا غائب شریک تجارت میں شریک سمجھا جاتا ہے یا نہیں؟ اور اس کی شرکت ختم ہوجاتی ہے یا نہیں؟

۵- اگر کسی شریک کے مستعفی ہونے کے بعد باقی شرکاء ان کے اِستعفاء کا جواب (یعنی ان کو باقی شرکاء ان کے استعفاء کی قبولیت یا عدمِ قبولیت کی اطلاع) نہ دے تو ایسا اِستعفاء جو معاہدے کی دفعہ کے مطابق دیا گیا، شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

۶- معاہدۂ شرکت میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی شریک نے تحریراً شرکت سے الگ ہونے کا اِستعفاء دیا تو اِستعفاء کی تاریخ کے چھ ماہ بعد اس کی شرکت ازخود ختم ہوجائے گی، آیا اس دفعہ کے مطابق اگر کسی شریک نے تحریراً اِستعفاء دیا تو اس کی شرکت ختم ہوجائے گی یا نہیں؟

۷- اگر کسی شریک کے اس طرح مستعفی ہونے کے بعد بھی باقی شرکاء ان کو شریکِ تجارت مانتے رہے یعنی تقسیمِ مال کے وقت ان کو باقی شرکاء ان کا چوتھا حصہ دیتے رہے تو آیا مستعفی ہونے کے بعد باقی شرکاء سے اپنا چوتھا حصہ ملنے کی بناء پر اس کی شرکت باقی رہتی ہے یا ختم ہوجاتی ہے؟

۸- اگر کسی شریک نے اپنی طرف سے اِستعفاء تحریر کیا لیکن اس کا علم کسی شریک کو نہیں ہوا، اب کئی برس کے بعد اتفاقاً کہیں سے مذکورہ اِستعفاء ملا تو جبکہ یہ اِستعفاء بظاہر کسی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا، نہ کسی کو اس کا علم تھا، شرعاً معتبر ہوگا یا نہیں؟ اور اگر معتبر ہے تو کس تاریخ سے اس کا اعتبار ہوگا؟

۹- اگر کوئی شریک معاہدہ نامے کی مخصوص دفعہ کے خلاف اپنا اِستعفاء باقی شرکاء کو پیش کرے تو ایسا اِستعفاء شرعاً معتبر ہوگا یا نہیں؟

۱۰- ایک شریک کے انتقال کے بعد باقی تمام شرکاء نے ایک مجلس منعقد کر کے اس میں مرحوم شریک کی اولاد کو ان کی جگہ شریکِ تجارت بنانے کا عقد کیا، اب بعض شرکاء کا یہ کہنا ہے کہ اس مجلس میں یہ عقد ضرور کیا گیا اور ہماری موجودگی میں کیا گیا، اور ہم نے اس سے اس وقت انکار بھی نہیں کیا، لیکن ہم نے عقد ہونے کے وقت اس لئے اپنی نامنظوری اور انکار اور عدمِ رضاء ظاہر نہیں کی کہ ہمارا بڑا بھائی موجود تھا، اور چونکہ ان کی موجودگی میں ہم نے کبھی ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا اس واسطے ہم نے بالارادہ سکوت اِختیار کیا، تو آیا شرعاً ایسے سکوت کے باوجود مرحوم کی اولاد شریکِ تجارت مانی جائے

گی یا نہیں؟ (از راہِ کرم ضمیمہ متعلق بسوال نمبر ۵ اور ۶ ملاحظہ فرمائیں)۔

دُعا گو

بندہ بشیر احمد سنجالوی غفرلہٗ ولوالدیہ

از جوہانسبرگ جنوبی افریقہ

مخدومی ومکرمی

اس مسئلے اور معاملے میں آنجناب کی خاص مدد کی اشد ضرورت ہے، پوری اُمید آنجناب سے وابستہ ہے کہ ہر طرح کی مدد فرمائیں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ آنجناب کے درجات سرفراز فرمائیں، آمین۔

طالبِ دُعا

بندہ بشیر احمد

بندہ شعبہ غفرلہٗ

(ضمیمہ از مستفتی متعلق بسوال نمبر ۵ اور ۶)

۱- مذکورہ مستعفی نے زبانی طور پر استعفاء دیا، پھر دوبارہ تحریراً اِستعفاء دیا، اور اس کے بعد اپنے اِستعفاء کے پیش کرنے کی شرکاء یاددہانی کراتے رہے، اور اس کے بعد انہوں نے خود شرکت کی تمام تجارتوں کا مکمل حساب وگوشوارہ تیار کیا جس میں انہوں نے اپنی شرکت کے حصے کی مجموعی قیمت لگا کر تحریر کی، اس مجموعہ قیمت سے کسی شریک نے انکار نہیں کیا تھا، اب مذکورہ تمام اُمور یعنی اِستعفاء پیش کرنے، نیز یاددہانی کرنے اور نام بنام دُوسرے شرکاء سے اس مجموعہ قیمت کی نقلیں بھیج کر پھر تجارت سے دست بردار ہوکر کام چھوڑ کر چلے جانا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے اِستعفاء کی پختگی مقصود تھی، اور یہ کہ وہ ہر طرح سے مکمل طور پر مستعفی ہونے کو چاہتے تھے، اب ایسے شریک کا اس طرح اِستعفاء دینا آیا من حیث الشرع مسموع ومعتبر ہوگا یا نہیں؟

۲- نیز مذکورہ مستعفی اِستعفاء دینے کے بعد وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت مختلف رقمیں شرکت کی تجارت سے کچھ پندرہ بیس سال تک برابر وصول کرتے گئے، اب آیا ان مختلف رقموں کو کس چیز کے عوض میں شمار کیا جائے گا؟ آیا اس کی شرکت کا حصہ شمار ہوگا یا قرضہ مان لیا جائے؟ فقط۔

(معاہدۂ شرکت)

(تمہید)

الف:- چاروں شریکوں نے اقرار کیا کہ موسیٰ اسماعیل کی تمام جائیداد اور دیگر ملکیتوں کو انہوں نے حاصل کیا ہے۔

ہم نے ان کو کوئی دھمکی نہیں دی، جس پر یہ بعد میں مفتی اکمل صاحب کے پاس ہمیں لے گئے اور ان کے سامنے مروّجہ طور پر ایک فیصلہ طے پایا جو بعد میں لکھ لیا گیا۔

جہاں تک اِستفتاء میں یہ بات کہی گئی ہے کہ کرایہ کی رسید لی تھی اور محمد اسلم خان کو کرایہ نہیں دیا تھا، تو انہوں نے ہم سے بھی کرایہ کی رسید کے وقت یہ بات کہی تھی کہ ہم کرایہ نہیں دیں گے، جس کے ہاتھ پر ہم بیچیں گے آپ اس سے کرایہ لیجئے گا، تو ہم نے ان کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا اور کہا تھا کہ کرایہ دینا پڑے گا۔

اور ہم اس بات پر حلف اُٹھا سکتے ہیں کہ کرایہ داری کی رسید کے لئے ہم نے ان پر کوئی زور زبردستی نہیں کی، بلکہ جب انہوں نے کہا کہ ہم ڈیفالٹر ہوجائیں گے، تو ہم نے کہا تھا کہ اس سے بچنے کے لئے آپ عدالت میں کرایہ جمع کرادیں تاکہ آپ کا حقِ قبضہ باقی رہے۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ

تنقیحات

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب اسی کاغذ کے ساتھ لکھ کر بھیجیں، اِن شاء اللہ اس کے بعد جواب دیا جائے گا:-

۱:- سوال کے پہلے صفحے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مارکیٹ اور اس کی تمام دُکانیں محمد اسلم کی ملکیت تھیں، جن میں سے پوری مارکیٹ کی حقیقی ملکیت اس نے آپ کے نام منتقل کی، اور پانچ خالی دُکانیں قبضہ سمیت دیں۔ لیکن دُوسرے صفحے پر لکھا ہے کہ ''وہ مارکیٹ اسلم خان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ مروّجہ پگڑی کا مالک تھا'' ان دونوں باتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، صحیح صورت کیا ہے؟ محمد اسلم مارکیٹ کا مالک تھا یا نہیں؟ اور اس نے آپ کو مارکیٹ مالکانہ طور پر فروخت کی؟ یا اس مارکیٹ میں صرف پگڑی لینے کا حق فروخت کیا؟ دُوسری صورت میں اس کا اصل مالک کوئی اور ہے یا نہیں؟

۲:- جب آپ نے محمد اسلم سے مارکیٹ خریدی تو کیا آپ کو معلوم تھا کہ تین دُکانیں مولوی محمد منیر صاحب کے پاس رہن ہیں؟

۳:- مفتی محمد اکمل صاحب کی موجودگی میں جو فیصلہ طے پایا تھا، اس کی نقل ارسال فرمائیں۔

۴:- یہ فیصلہ جو ''مفتی محمد اکمل صاحب'' کی موجودگی میں ہوا، اس میں مولوی محمد منیر نے کیا اپنے آپ کو بحیثیت کرایہ دار واقعۃً تسلیم کیا تھا؟ یا یہ بات واضح تھی کہ وہ اپنے آپ کو کرایہ دار تسلیم نہیں کرتے، بلکہ بحیثیت مرتہن دُکانوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے قانونی مجبوری کے تحت کرایہ داری لکھ رہے ہیں؟

۵:- کیا جب سے آپ نے محمد اسلم سے مارکیٹ خریدی اس وقت کے بعد کسی وقت مولوی محمد منیر صاحب نے اس بیع کی اجازت دی؟ یا آپ کو پوری مارکیٹ کا مالک تسلیم کیا؟ یا کوئی ایسا کام کیا

جس سے آپ کے مالک ہونے کا اعتراف لازم آتا ہو؟ احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۱/۶/۱۱ھ

جوابِ تنقیحات

۱:- یہ دومختلف مارکیٹیں ہیں، جن میں سے پہلی مارکیٹ کی مالک محمد اسلم کی اہلیہ تھی اور اسی مارکیٹ کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے، اور دُوسری مارکیٹ یوسف مارکیٹ ہے جس میں دو دُکانیں مروّجہ پگڑی پر محمد اسلم نے خریدی ہوئی تھیں اور محمد اسلم نے ان دو دُکانوں کے بارے میں بھی تقریباً وہی مضمون محمد اقبال کو لکھ کر دیا ہوا ہے، جو پہلی مارکیٹ میں مولوی منیر صاحب کو لکھ کر دیا تھا، یعنی اگر فلاں وقت تک رقم ادا نہ ہوتو دُکانیں فروخت کر کے رقم وصول کرلیں۔ محمد اقبال اور محمد اسلم کے پاس معاہدے کی فوٹو کاپی ساتھ میں منسلک ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کو حقِ قبضہ (مروّجہ پگڑی) اور کرایہ داری دیا جارہا ہے، اسی لئے اس نے کرایہ داری کی رسید مولوی منیر صاحب کو جاری کی تاکہ کوئی ان کے کرایہ داری کے حق کو سلب نہ کرسکے اور قبضہ واپس نہ لے سکے۔

۲:- جب مارکیٹ ہمارے نام منتقل ہوئی اس وقت محمد اسلم نے ہم سے کہا تھا کہ تین دُکانیں مولوی منیر صاحب کو دے کر کرایہ کی رسید جاری کردی جائے، جب وہ کسی کو بیچیں تو کرایہ کی رسید بدل دینا، اس کا ذکر ہم اِستفتاء میں کرچکے ہیں۔

۳:- مفتی اکمل صاحب کی موجودگی میں جو فیصلہ ہوا اس کی نقل حاضرِ خدمت ہے۔

۴:- مولوی منیر صاحب نے ہمارے پاس آکر سب سے پہلے تین باتیں کی، اوّل یہ ہے کہ آپ کے علم میں ہے کہ تین دُکانیں اسلم صاحب نے ہمیں کرایہ کی رسیدیں دے کر قبضہ دیا ہوا ہے، تاکہ ہم اس کو بیچیں اور اپنی رقم وصول کرلیں۔ (دُوسری بات) اب آپ رسیدیں دیں اور کرایہ نہ لیں جس کو ہم بیچیں کرایہ آپ اسی سے لیں، اور ہم نے اسلم صاحب سے بھی رسیدیں لے کر کرایہ نہیں دیا تھا۔ (تیسری بات) جب ہم فروخت کریں تو رسید بدلوائی بھی نہیں دیں گے، وہ لینے والا آئندہ آپ اس سے رسید بدلوائی لے سکتے ہیں۔

ہم نے اس کو قبول نہیں کیا، اور تینوں دُکانوں کے کرایہ کا مطالبہ کیا اور رسید بدلوائی کے ۵ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا کہ جب آپ بیچیں گے تو ہم آپ سے پانچ لاکھ روپیہ لیں گے، اس پر وہ اور ہم جناب مفتی اکمل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں ان کی موجودگی میں جو طے ہوا اس کی نقل موجود ہے کہ تینوں دُکانوں کا کرایہ گیارہ سو روپے ماہانہ اور فروخت کر کے دو لاکھ روپیہ ہم کو دیں گے، یہ بات طے ہوئی اس فیصلے کی نقل منسلک ہے۔

۵:- مندرجہ بالا باتیں جو ہم سے مولوی منیر صاحب نے کی تھیں وہ ہم کو مالک تسلیم کر کے ہی کی تھیں، اور ہم نے سارے کاغذات ان کو دِکھا دیئے تھے، اور یہ ہم کو کرایہ دیتے رہے مسلسل چھ ماہ تک اس درمیان ہم سے کوئی بات نہیں ہوئی، چھ ماہ بعد نیا اِستفتاء مرتب کر کے فتویٰ لیا اور نئی چیز کھڑی کر دی اس دوران ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ ۱۹۹۰-۱۲-۳۰

مزید تفصیل جواب نمبرا: محمد اسلم نے جو تحریر مولوی منیر صاحب کو دی ہے اس تحریر کی بنیاد پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ یکم اکتوبر تک ادائیگی کہی تھی، ورنہ فروخت کا اختیار دیا تھا اور کرایہ داری کی رسید دے کر یہ بات ثابت کی کہ حقِ کرایہ داری فروخت کرسکتا ہے، گویا کہ حقِ کرایہ داری (مروّجہ پگڑی) کو رہن رکھوایا، اگر ملکیت رہن رکھی ہوئی ہوتی تو قاعدے کے حساب سے جائیداد کے کاغذات رکھوائے جاتے ہیں اور بیچنے کا اختیار دیا جاتا ہے، یہاں کرایہ داری کی رسید جاری کی یعنی وہ پگڑی پر بیچ سکتا ہے، اس لئے کہ مولوی منیر اور محمد اقبال دونوں کو جو تحریر دی ہے وہ ایک جیسی ہے، اور دونوں کو فروخت کی اجازت دی ہے اور حقِ کرایہ داری۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ

جواب:- اس قضیہ سے متعلق ہمارے پاس اس سے پہلے شبیر احمد صاحب کی طرف سے ایک اِستفتاء آچکا ہے، کیونکہ اس قسم کے معاملات میں فریقین کے بیانات عموماً متضاد ہوتے ہیں جن سے مسئلے کے شرعی حکم پر فرق پڑ جاتا ہے، اس لئے اُن کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے فریقِ مخالف یعنی حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے ساتھ مل کر ایک متفقہ اِستفتاء مرتب کریں تاکہ صورتِ مسئلہ دونوں کے اتفاق سے سامنے آنے کے بعد جواب دونوں کے لئے واجب التسلیم ہو، لیکن انہوں نے متفقہ سوال کے مرتب ہونے کے اِمکان کی نفی کرتے ہوئے اپنے سوال کا جواب طلب کیا۔ مفتی کا کام چونکہ واقعات کی تحقیق نہیں ہے، بلکہ وہ سوال کی صورت کے مطابق جواب دینے کا پابند ہے، چنانچہ سوال کی جو نوعیت اُس وقت تحریری طور پر بیان کی گئی اُس وقت اُس کے مطابق جواب دے دیا گیا، جو مؤرخہ ۲۸/۱۰/۱۴۱۰ھ کو ہمارے دارالافتاء سے جاری ہوا۔ اُس کے تقریباً آٹھ مہینے کے بعد حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کی طرف سے یہ اِستفتاء موصول ہوا، اُن کو بھی یہی مشورہ دیا گیا کہ صورتِ سوال متفقہ طور پر فریقین کی طرف سے بطورِ اِستفتاء پیش کی جائے تو قضیہ کے حل میں سہولت ہوگی۔ لیکن انہوں نے بھی اس سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے اپنے سوال کا جواب طلب کیا۔ اور اس اِستفتاء کو جوابِ تنقیحات کے ساتھ غور سے پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ اس سوال میں صورتِ مسئلہ اُس صورتِ مسئلہ سے مختلف ہے جو شبیر احمد صاحب کے اِستفتاء میں بیان کی گئی تھی، دُوسرے متعدّد اختلافات کے علاوہ دونوں سوالات میں دو بنیادی فرق موجود ہیں، جن کی وجہ سے مسئلے کے شرعی حکم پر

بہت فرق پڑتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ شبیر احمد صاحب کے استفتاء میں یہ بات ظاہر تھی کہ محمد اسلم نے مولوی منیر احمد صاحب کو دُکانیں رہن کے طور پر دی تھیں، صرف اُن کا حقِ کرایہ داری رہن نہیں رکھا تھا، جبکہ حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ استفتاء میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ محمد اسلم نے دُکانیں نہیں بلکہ اُن کا صرف حقِ کرایہ داری مولوی منیر احمد صاحب کے پاس رہن رکھا تھا۔

اور دُوسرا فرق یہ ہے کہ شبیر احمد صاحب کے استفتاء کے مطابق مفتی محمد اکمل صاحب کی موجودگی میں حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے لئے کرایہ داری کی جو تحریر لکھی گئی تھی وہ محض قانونی مجبوری اور دباؤ کے تحت لکھی گئی، برضا و رغبت نہیں، جبکہ حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ استفتاء میں زور زبردستی یا کسی قسم کے دباؤ کی نفی کی گئی ہے۔

اب حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ استفتاء میں یہ کہا گیا ہے کہ محمد اسلم نے مولوی منیر احمد صاحب کو دُکانیں رہن نہیں رکھی تھیں بلکہ صرف اُن کا حقِ کرایہ داری رہن رکھا تھا، اور جب اُس نے یہ کہا تھا کہ اگر وہ یکم اکتوبر تک ادائیگی نہ کرے تو مولوی منیر احمد صاحب کو یہ دُکانیں فروخت کرنے کا اختیار ہوگا، تو اس سے مراد دُکانوں کی حقِ ملکیت کی فروختگی نہیں بلکہ حقِ کرایہ داری کی فروختگی مراد تھی (جس کو عرفِ عام میں پگڑی کہتے ہیں) اگرچہ جو الفاظ محمد اسلم کی تحریر میں موجود ہیں اُن سے اس صورتِ حال پر دلالت نہیں ہوتی (اور محض یہ بات کہ یہی الفاظ محمد اقبال کے لئے لکھی گئی تحریر میں بھی موجود ہیں، جن کا مقصد پگڑی کا رہن ہے، اس بات کے لئے کافی نہیں کہ مولوی منیر احمد صاحب کی تحریر میں بھی اُن کے وہی معنی لئے جائیں، کیونکہ اوّل الذکر دُکانوں میں محمد اسلم صرف حقِ کرایہ داری کا مالک تھا، اور ثانی الذکر میں حقِ ملکیت اُس کا تھا) لیکن کاروباری عرف کے لحاظ سے اُن الفاظ میں پگڑی کے تصوّر کا احتمال ضرور موجود ہے، اور اگر مولوی منیر احمد صاحب اور محمد اسلم کے درمیان یہ بات باہم طے شدہ تھی کہ مولوی منیر احمد صاحب کو صرف حقِ کرایہ داری دیا جارہا ہے، اور مولوی منیر احمد صاحب نے یہی سمجھ کر اُن دُکانوں کا قبضہ لیا تھا تو بے شک یہی سمجھا جائے گا کہ محمد اسلم نے صرف حقِ کرایہ داری ان کی طرف منتقل کیا تھا، اور سوال سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات مولوی منیر احمد صاحب پر اچھی طرح واضح تھی، جس کی دلیل یہ ہے کہ جوابِ تنقیح نمبر۴ کے مطابق مولوی منیر صاحب نے حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے پاس آکر جو تین باتیں کہیں ان میں سے دُوسری بات یہ تھی کہ: ''جس کو ہم بیچیں، کرایہ آپ اُسی سے لیں'' ان الفاظ سے واضح ہے کہ خود اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ جو کچھ فروخت کریں گے وہ حقِ کرایہ داری ہوگا، کیونکہ حقِ ملکیت کہنے کی صورت میں

حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے خریدار سے کرایہ لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا اگر یہ بات دُرست ہے کہ محمد اسلم نے مولوی منیر صاحب کو محض حقِ کرایہ داری کا قبضہ دیا تھا اور یہ بات مولوی منیر صاحب پر بھی واضح تھی اور انہوں نے حافظ عبدالرشید سورتی صاحب سے وہ بات کہی تھی کہ: ''ہم جس کو بیچیں، کرایہ آپ اُسی سے لیں'' تو شرعی حکم یہ ہے کہ یہ رہن دُرست نہیں ہوا، کیونکہ محض حقِ کرایہ داری یا پگڑی کا حق شرعاً نہ قابلِ فروخت ہے، نہ اس کو رہن رکھا جاسکتا ہے، اور پگڑی یا محض رسید بدلوانے کے اُوپر کسی رقم کا لین دین بھی شرعاً جائز نہیں ہے، اور جب یہ رہن صحیح نہیں ہوا تو مولوی منیر صاحب کا دَین بدستور محمد اسلم کے ذمے واجب ہے، اور دُکانوں کی ملکیت چونکہ عقدِ بیع کے ذریعہ حافظ عبدالرشید صاحب سورتی کی طرف منتقل ہوچکی ہے، لہٰذا وہ دُکانیں اُن کی ملکیت ہیں اور مولوی منیر صاحب کے ذمہ دُکانوں کا کرایہ واجب ہوگا۔

اور مذکورہ بالا تفصیل کے بعد دُوسری بات (یعنی کرایہ داری کی تحریر کے جبری یا رضامندی کے ساتھ ہونے کے مسئلے) پر بحث کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ اس مسئلے کا تعلق اس صورت سے ہے جب دُکانوں کا حقِ کرایہ داری نہیں بلکہ دُکانیں رہن رکھی گئی ہوتیں، اور اس اِستفتاء کی بنیاد چونکہ پہلی صورت پر ہے اس لئے اب اس بحث میں پڑنا غیرضروری ہے۔

اور یہ بات ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مروّجہ پگڑی اور رسید بدلوانے پر رقم وصول کرنا شرعاً ہرگز جائز نہیں ہے، اور فریقین کو اس قسم کے معاملات سے مکمل پرہیز کرنا ضروری ہے۔

فی الھندیة (ج:۵ ص:۴۳۵)[۱]: ما یجوز بیعه یجوز رھنه وما لا یجوز بیعه لا یجوز رھنه.

وفی الدّر عن الأشباه: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجرّدة .... الخ. (جلد:۴ ص:۵۱۸)[۲].

وفی الشامیة ناقلًا عن البدائع: الحقوق المفردة لا تحتمل التّملیک ولا یجوز الصّلح عنھا. اھ۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۱/۷/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۴۸/۲)

---

(۱) (طبع رشیدیه کوئٹه) وفی الدّر المختار، کتاب الرّھن ج:۶ ص:۴۹۰ (طبع سعید) وفی الأشباه ما قبل البیع قبل الرّھن، وفی الشامیة تحته قوله ما قبل البیع قبل الرّھن ای کل ما یصحّ بیعه صحّ رھنه.

وکذا فی شرح مجلّة الأحکام المادّة:۲ ج:۱ ص:۱۲۱، وراجع أیضًا: ''فقھی مقالات'' ج:۱ ص:۱۵۹ بیع حقوق المجرّدة.

(۲) (طبع ایچ ایم سعید).

مرابحہ، اِجارہ یا مشارکہ کی تمویل میں رہن طلب کرنے کا حکم

سوال:- محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ مع الخیر ہیں، اُمید کہ آنجناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔

یہاں چینائی میں چند مخیّر حضرات نے مل کر اپنے ایک دیرینہ خواب ''بلاسودی مالیات'' (Interest Free Financing) پر چند مہینوں سے کوشش شروع کی تھیں، ان شاء اللہ بہت جلد وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا ہے۔ اسی سلسلے میں مندرجہ ذیل ایک مسئلے پر علماء کی رائے مطلوب ہے۔

کیا کسی بزنس یا پروجیکٹ کے لئے مالیات کی فراہمی کے لئے کسی بھی قسم کا رہن کا طلب کرنا ممنوع ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات یہاں واضح ہو کہ اسلامی بینک قائم کرنے کی کئی کوششیں ہندوستان میں کی گئیں، مگر اکثر ناکام رہیں، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ رقم لینے کے بعد کسی قسم کی پابندی/ ذمہ داری کی غیر حاضری پر رقم لینے والے کو رقم لوٹانے کی فکر نہیں رہتی یا پروانہیں رہتی۔

اگر یہ ممنوع ہے تو دی گئی پونجی کی حفاظت کی اور کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس معاملے پر تفصیلی روشنی ڈالیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رہن طلب کرنے کا جائز یا ناجائز ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ مالیات کی فراہمی کس بنیاد پر کی جارہی ہے؟ اگر مرابحہ کی بنیاد پر ہے تو چونکہ وہ ایک بیع ہے جس کی قیمت مستقبل میں واجب الاداء ہونے کی وجہ سے خریدار کے ذمے دَین بن چکی ہے،[1] اس لئے گاہک سے رہن طلب کرنا بالکل جائز ہے۔[2] اسی طرح اگر تمویل اِجارہ کی بنیاد پر ہے تب بھی اُجرت کی توثیق کے لئے رہن طلب کرنا جائز ہے۔ لما فی البحر: ''ولا یلزم علینا صحۃ الإبراء عن الأجرۃ والکفالۃ والرھن بھا لأنا

(۱ و ۲) وفی الدر المختار، کتاب الرھن ج:۶ ص:۴۷۷، ۴۷۸ (طبع سعید) ھو حبس شیءٍ مالیءٍ بحقٍ یمکن استیفاءہ ای أخذہٗ منہٗ کلًا أو بعضًا کان قیمۃ المرھون أقل من الدّین (کالدّین) کاف الاستقصاء لأنّ العین لا یمکن استیفاؤھا من الرّھن الّا اذا صار دینا حکمًا کما سیجیء حقیقۃ وھو دین واجب ظاھرًا وباطنًا أو ظاھرًا فقط کثمن عبد .... أو حکمًا کالأعیان المضمونۃ بالمثل أو القیمۃ ...الخ.

وفی الھدایۃ، کتابُ الرّھن ج:۴ ص:۵۱۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا یصح الرّھن الّا بدین مضمون لأن حکمہ ثبوت ید الاستیفاء والاستیفاء یتلو الوجوب.

وفی الدر المختار ج:۶ ص:۴۹۷ (طبع سعید) باع عبدًا علٰی أن یرھن المشتری بالثمن شیئًا بعینہٖ أو یعطی کفیلًا کذٰلک بعینہٖ صحّ ولا یجبر المشتری علی الوفاء لما مرّ انّہٗ غیر لازم وللبائع فسخہٗ لفوات الوصف المرغوب الّا أن یدفع المشتری الثمن حالًا أو یدفع قیمۃ الرّھن المشروط رھنا لحصول المقصود.

وفی الشامیۃ تحت (قولہ لفوات الوصف المرغوب) لأن الثمن الّذی بہ رھن أوثق ممّا لا رھن بہٖ فصار الرّھن صفۃ للثمن وھو وصف مرغوب فلہ الخیار بفواتہ.

نقول: ذاک بناء علیٰ وجود السبب فصار کالعفو عن القصاص بعد وجود الجرح" (البحر الرائق ج:۷ ص:۱۱۵)۔[۱] لیکن یاد رہے کہ رہن کا مقصد صرف ادائیگی کی توثیق (Security) ہے۔ لہٰذا مرتہن (یعنی صورتِ مسئولہ میں مالیات فراہم کرنے والے) کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس رہن سے کسی بھی صورت میں فائدہ اُٹھائے۔[۲] البتہ اگر مدیون ادائیگی نہ کرے تو اسے بیچ کر اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔

اور اگر تمویل مشارکہ کی بنیاد پر ہے تو اس صورت میں رہن طلب کرنا جائز نہیں،[۳] کیونکہ شریک مدیون نہیں ہوتا۔[۴] البتہ وہ اگر خیانت کرے یا اپنے فرائض صحیح طریقے سے بجا نہ لائے تو اس وقت وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۸۹۶/۱۱)

***

---

(۱) البحر الرائق، کتاب الاجارۃ ج:۷ ص:۳۰۰ (طبع سعید) نیز گزشتہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے ص:۴۲۲ تا ۴۲۳ کے فتاویٰ اور اُن کے حواشی۔

(۳ و ۴) وفی الهداية ج:۴ ص:۵۲۴ و ۵۲۵ (طبع رحمانیه) ولا يصح الرّهن بالأمانات كالودائع والعوارى والمضاربات ومال الشركة لأنّ القبض فى باب الرّهن قبض مضمون فلا بد من ضمان ثابت ليقع القبض مضمونًا ويتحقق استيفاء الدّين منه.

وفى حاشيته قوله قبض مضمون اى قبض يصير به المقبوض مضمونًا على القابض بقدر الدّين فلا بد من ضمان على الرّاهن حتى يصير المرهون مضمونًا على المرتهن بقدر ذلک الضمان وليس فى الأمانات ضمان فان حق صاحب الأمانة مقصود على العين.

وفى الدر المختار ج:٦ ص:۴۹۲ (طبع سعيد) ولا بالأمانات كوديعة وأمانة.

وفى الشامية (قوله كوديعة وأمانة) الأصوب وعارية وكذا مال مضاربة وشركة كما فى الهداية ...الخ.

کتاب الهبة

(ہبہ کے مسائل کا بیان)

۱:- مرض الوفات سے قبل ہبہ کیا جاسکتا ہے اور بیوی کو کتنا مال ہبہ کرنا چاہئے؟
۲:- ہبہ زبانی بھی ہوسکتا ہے مگر قبضہ ضروری ہے

سوال۱:- کیا انسان اپنا مال اور مملوکہ جائیداد اپنے کسی وارث کو اپنی زندگی میں دے سکتا ہے یا نہیں؟ میں عمر کے آخری حصے میں ہوں، میں چاہتا ہوں کہ بیوی کو اور دُوسرے وارثوں کو جائیداد وغیرہ دے دُوں، بیوی کو کتنا دینا چاہئے؟ کیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ اور اپنا مال کسی کو دینا چاہوں تو دے سکتا ہوں؟

سوال۲:- کیا میں زبانی طور پر کسی کو ہبہ کرسکتا ہوں؟ اور زبانی ہبہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس سے دُوسرا مالک بن جائے گا یا نہیں؟ ہبہ کا بہتر طریقہ کیا ہے اور ہبہ اپنی کیسی حالت تک کرسکتا ہوں؟

جواب۱:- مرضِ وفات (یعنی وہ مرض جس میں انسان کی موت واقع ہو) سے پہلے پہلے انسان اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر طرح کا جائز تصرف کرسکتا ہے،[۱] جس میں ہبہ بھی داخل ہے،[۲] لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہے جس سے ایک وارث کے سوا تمام دُوسرے ورثاء اس کی جائیداد سے محروم ہوجائیں،[۳] لہٰذا بہتر صورت آپ کے لئے یہ ہے کہ بیوی کے مہر معاف کردینے کے باوجود

(۱و۲) وفی شرح المجلّة للاتاسیؒ ج:۴ ص:۱۳۲ رقم المادّة: ۱۱۹۲ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء لأنّ کون الشیء ملکًا لرجل یقتضی أن یکون مطلقًا فی التّصرف فیه کیفما شاء.
وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز ج:۱ ص:۶۵۴ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع حنفیه کوئٹه) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء.
(۳) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۳۵۲ (طبع قدیمی) عن حُمید بن عبدالرحمٰن ومحمّد بن النعمان بن بشیر أنّهما حدثاه عن النّعمان بن بشیر رضی الله عنه أنّ أباه أتٰی به الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: انّی نحلت ابنی هذا غلامًا، فقال: أکلّ ولدک نحلت مثله؟ قال: لا! قال: فارجعه.“
وفی فتح الباری ج:۵ ص:۲۸۰ (طبع مکتبة الرشد) وذهب الجمهور الیٰ أنّ التسویة مستحبة فان فضل بعضًا صحّ وکره، واستحبت المبادرة الی التسویة أو الرّجوع فحملوا الأمر علی النّدب والنّهی علی التّنزیه.
وکذا فی عمدة القاری ج:۱۳ ص:۲۱۴ إلیٰ ص:۲۱۶ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) وکذا فی اعلاء السنن ج:۱۶ ص:۹۶، ۹۷ (طبع ادارة القرآن کراچی)
وفی شرح الطیبی علی المشکوٰة ج:۶ ص:۱۸۱ ولو وهب جمیع ماله من ابنه جاز وهو آثم، نص علیه محمد .....الخ.
وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید) لا بأس بتفضیل بعض الأولاد ..... وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده یسوّی بینهم ...... ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز وأثم.
وفی الهندیة ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشیدیه) ولو وهب شیئًا لأولاده فی الصّحّة وأراد تفضیل البعض علی البعض عن أبی حنیفة لا بأس به، اذا کان التفضیل لزیادة فضل فی الدّین وان کانا سواء یکره. وروی المعلی عن أبی یوسفؒ أنّه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بینهم وهو المختار ....الخ.
وکذا فی البحر الرّائق، کتاب الهبة ج:۷ ص:۲۸۸ والبزازیة علی هامش الهندیة ج:۶ ص:۲۳۷ وفتاوی قاضی خان ج:۳ ص:۲۷۹.

آپ اُسے مہر کی رقم یا اس قیمت کی جائیداد دے دیں، یا اگر اس کو ناکافی سمجھیں تو جائیداد کا اتنا حصہ مزید بیوی کو ہبہ کردیں جس کی آمدنی سے اس کی گزراوقات بہ آسانی ہوسکے، اور باقی جائیداد اپنی ملکیت میں رکھیں جو آپ کے بعد آپ کے تمام شرعی ورثاء میں تقسیم ہوسکے۔

جواب۲:- ہبہ زبانی بھی ہوسکتا ہے،[۱] لیکن ہبہ کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک موہوب لۂ (یعنی وہ شخص جس کو ہبہ کیا جارہا ہے) اس پر قبضہ نہ کرلے[۲] اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہبہ تحریری طور پر کیا جائے اور اس پر دو گواہ بھی بنالئے جائیں تاکہ آئندہ کوئی تنازعہ نہ ہوسکے۔ واضح رہے کہ بیوی کے لئے کسی بھی قسم کا ہبہ صرف اس وقت شرعاً نافذ ہوگا جبکہ وہ مرض الموت سے پہلے پہلے کرلیا جائے، اگر بیماری کی حالت میں ہبہ کیا اور اسی بیماری میں انتقال ہوگیا تو یہ ہبہ کالعدم ہوگا۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

---

(۱) وفی الهداية ج:۳ ص:۲۸۵ (طبع مكتبه رحمانيه، و ج:۳ ص:۲۸۳ فی طبع مكتبه شركت علميه) وتصحّ بالايجاب والقبول .....الخ.

وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار ج:۵ ص:۲۸۸ (طبع سعيد) وركنها هو الايجاب والقبول ..... الخ.

وفی الدّر المنتقى على مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۰ (طبع غفاريه كوئته) وتصحّ بايجاب وقبول ولو بالفعل فی حق الموهوب لهٗ.

وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۳ ص:۳۴۴ (طبع مكتبه حبيبيه) تنعقد الهبة بالايجاب والقبول ..... الخ.

(۲) وفی الدّر المختار، كتاب الهبة ج:۵ ص:۲۸۸ (طبع سعيد) وشرائط صحتها فی الموهوب أن يكون مقبوضًا.

وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۹۰ وتتم الهبة بالقبض الكامل.

وفی مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۱ (طبع غفاريه كوئته) وتتم بالقبض الكامل لقوله عليه الصلوٰة والسلام لا تجوز الهبة الّا مقبوضة.

وفی الهداية ج:۳ ص:۲۸۵ و۲۸۶ (طبع مكتبه رحمانيه) وتصحّ بالايجاب والقبول والقبض ..... قوله عليه السلام لا يجوز الهبة الّا مقبوضة.

وفی ملتقى الأبحر ج:۳ ص:۴۸۹ وتتم (الهبة) بالقبض الكامل.

وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز ص:۴۶۲ وتتم بالقبض الكامل لأنها من التبرّعات والتبرع لا يتمّ الّا بالقبض ......الخ. وفيها أيضًا ج:۱ ص:۴۷۳ رقم المادّة:۸۶۱ يملك الموهوب لهٗ الموهوب بالقبض شرط لثبوت الملك. وكذا فی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۳ ص:۳۴۴ رقم المادة:۸۳۷ وج:۳ ص:۳۸۱ رقم المادة:۸۶۱ (طبع مكتبه حبيبيه كوئته).

(۳) وفی الهندية، كتاب الهبة، الباب العاشر فی هبة المريض ج:۴ ص:۴۰۰ (طبع رشيديه) لا تجوز هبة المريض ولا صدقته الّا مقبوضة فاذا قبضت فجازت من الثلث، واذا مات الواهب قبل التّسليم بطلت.

وكذا فی البزازية على الهندية ج:۶ ص:۲۳۹ (طبع رشيديه).

وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۰ (طبع سعيد) وهب فی مرضه ولم يسلم حتّى مات بطلت الهبة ..... الخ.

وفی شرح المجلّة للاتاسی رقم المادّة:۸۷۹ ج:۳ ص:۴۰۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئته) واذا وهب أحد فی مرض موته شيئًا لأحد ورثته وبعد وفاته لم تجز الورثة الباقون لا تصحّ تلك الهبة. وكذا فی الهداية، كتاب الوصايا ج:۴ ص:۶۵۷ (طبع شركت علميه ملتان).

وكذا فی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة:۸۷۹ ج:۱ ص:۴۸۳ (طبع حنفيه كوئته).

ہبہ کی گئی زمین موہوب لہٗ کی ملکیت ہے اور واہب کی موت کے بعد اُس میں میراث جاری نہیں ہوگی

سوال:- بکر نامی شخص کی دو لڑکیاں تھی، ان میں سے ایک کا نام فاطمہ اور دُوسری کا نام زینت تھا، اور دو لڑکے تھے، ان میں سے ایک کا نام غلام رسول تھا اور دُوسرے کا نام غلام نبی تھا، اور ایک بھانجا تھا جس کا نام خالد تھا۔

اور بکر کی دُوسری لڑکی فاطمہ کے بطن سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوا، لڑکے کا نام محمد شریف خان تھا، اور لڑکی کا نام کلثوم تھا، اور کلثوم کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ان میں سے ایک کا نام غازی خان ہے اور دُوسرے کا نام نبی خان ہے

اب بکر نے مرض الموت سے پہلے اپنی زمین کے کل تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے بھانجے خالد کو دے دیا، اور دو حصے اپنے دونوں بیٹے غلام رسول اور غلام نبی کو دے دیا، اور اپنی دونوں لڑکیاں یعنی فاطمہ اور کلثوم کو کچھ نہیں دیا، گویا کہ اپنی زمین کے حصے سے ان دونوں کو محروم کر دیا۔

اب فاطمہ جو بکر کی لڑکی ہے، اس کی لڑکی جو کلثوم ہے اُس کا بیٹا غازی خان یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ مجھے میری نانی یعنی فاطمہ کی میراث ملنی چاہئے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میری والدہ یعنی کلثوم مجھے فوت ہونے کے وقت یہ کہہ گئی ہے کہ آپ اپنی نانی فاطمہ کی میراث طلب کریں، اور اس دعوے پر غازی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے، اور غازی خان کے دُوسرے بھائی نبی خان نہ اپنی نانی کی میراث کا دعویٰ کر رہا ہے اور نہ اپنی والدہ کلثوم کی وصیت کا ذکر کرتا ہے، آیا اس صورتِ مذکورہ میں غازی خان کا یہ دعویٰ دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ بکر نے اپنی زندگی میں مرض الموت سے پہلے ہی[1] اپنی زمین اپنے بھانجے اور دو بیٹوں کو مالک و قابض بنا کر ہبہ کر دی تھی، اور اُنہوں نے اُس پر قبضہ بھی کر لیا تھا، تو اَب وہ زمین بکر کی ملکیت سے نکل کر بھانجے اور بیٹوں کی ملکیت میں آگئی،[2] اور اس سے بکر کے ورثاء کا کوئی تعلق نہیں رہا، چنانچہ یہ زمین بکر کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، اور دُوسرے ورثاء کو اس پر دعوے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں اگر بکر نے اس زمین کے علاوہ بھی کچھ مال یا جائیداد چھوڑی ہو تو وہ اس کے

(۱) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۲) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۹۲ (طبع سعید) وتتم الهبة بالقبض الكامل .... الخ. وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحكمها ثبوت الملك للموهوب لهٗ غير لازم .... الخ. وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وشرط صحتها فی الموهوب أن يكون مقبوضًا .... الخ. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگی، لہٰذا اُس زمین پر غازی خان کا دعویٰ شرعاً قابلِ قبول نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۵/۲۸ ب)

ہبہ دُرست ہونے کے لئے قبضہ ضروری ہے، محض کاغذات میں نام کرنے سے ہبہ نہیں ہوتا

سوال:- اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں کوئی جائیداد اپنی اولاد کے نام خریدتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ جائیداد میں نے اولاد کو ہبہ کردی، تو کیا اُس کے انتقال کے بعد ہبہ کی ہوئی جائیداد اُس کی وراثت میں شامل کرنی ہوگی؟

۲:- کیا شریعت میں صرف زبان سے کہہ دینے سے ہبہ ہوجاتا ہے یا اُس کے لئے لکھت ہونا ضروری ہے؟ کیا زبان سے کہہ دینے کے لئے کسی گواہ کا ہونا ضروری ہے؟

مثلاً زید نے اپنے بیٹے بکر کے نام ایک جائیداد خریدی، تمام کاغذات بکر کے نام ہیں، زید نے بکر سے اپنی زندگی میں کہہ دیا کہ یہ جائیداد تمہیں ہبہ کرتا ہوں، اس ہبہ کے گواہ موجود ہیں جو کہ بکر کی والدہ، دادی اور چاچا ہیں، کیا زید کے انتقال کے بعد اس ہبہ کی ہوئی جائیداد کو وراثت میں شامل کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب ۱، ۲:- شرعاً ہبہ کے لئے تحریری ہبہ نامہ مرتب کرنا ضروری نہیں، یعنی زبانی بھی ہوسکتا ہے،[1] البتہ یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو ہبہ کیا گیا ہے وہ ہبہ شدہ چیز پر قبضہ کرلے،[2] لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر بکر نے اس جائیداد پر زید مرحوم کی زندگی ہی میں قبضہ بھی کرلیا تھا تو یہ جائیداد بکر کی ملکیت ہوگئی،[3] زید کے دُوسرے ورثاء کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اس کو زید کے ترکے میں شامل نہیں سمجھا جائے گا۔

واضح رہے کہ محض کاغذات کسی کے نام بنوادینے سے ہبہ نہیں ہوتا، بلکہ زبانی یا تحریری طور پر ہبہ کی تصریح اور موہوب لہٗ کا اس پر قبضہ کرنا ضروری ہے،[4] یہاں چونکہ زبانی تصریح موجود ہے اس لئے قبضے کی شرط کے ساتھ ہبہ دُرست ہوگیا۔[5]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۰۸/۲۸ ج)

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۲ تا ۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(اس فتویٰ کی مزید وضاحت کے لئے سائل نے دوبارہ سوال بھیجا جو درج ذیل ہے)

''مکرّر اِستفتاء''

ہبہ کئے گئے مکان کا کرایہ وغیرہ وصول کرنے کے معاملات انجام دینا شرعاً اس پر ''قبضہ'' شمار ہوگا

سوال:- قبضہ موہوب لہٗ سے کیا مراد ہے؟ جبکہ خریداری زمین اور تمام سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں موہوب لہٗ کا نام درج ہے، یہ اس لئے وضاحت طلب کی جارہی ہے کہ اگر ہبہ شدہ عمارت میں ایک یا زیادہ کرایہ دار آباد ہوں تو قبضہ تو اُن کے پاس ہے، البتہ رسیدات وغیرہ دینے والا موہوب لہٗ ہے، اور وہی ٹیکس وغیرہ اپنے نام سے اَدا کرتا ہے، لہٰذا قبضہ مالکانہ مراد ہے یا آباد ہونا شرط ہے؟

۲:- موہوب لہٗ (بکر) نے واہب زید کی زندگی میں ہی مالکانہ قبضہ حاصل کرلیا تھا، البتہ جس بلڈنگ میں کرایہ دار آباد ہیں وہ اُسی طرح سے آباد بطور کرایہ دار چلے آرہے ہیں، تو کیا اس صورت میں موہوب لہٗ کا قبضۂ شرعی دُرست مانا جائے گا؟

جواب:- قبضے کے لئے موہوبہ مکان میں بذاتِ خود آباد ہونا ضروری نہیں، بلکہ صورتِ مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ واہب کرایہ داری کا معاملہ فسخ کردے، اور موہوب لہٗ کرایہ داروں سے نیا کرایہ داری کا عقد کرلے اس طرح جب کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرنے وغیرہ کے معاملات واہب کے بجائے موہوب لہٗ نے انجام دینے شروع کردیئے تو قبضہ ہوگیا، اور ہبہ مکمل ہوگیا۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۲۷ ج)

بغیر قبضے کے دو بھائیوں کو مشترکہ طور پر جائیداد ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- میرے تایا نے اپنی جائیداد اپنے دو بھائیوں یعنی میرے والد اور چچا کے نام کردی ہے، میرے تایا کی کوئی اولاد، بیوی، بہن وغیرہ نہیں ہے، میرے والد کی مذکورہ جائیداد جو اُنہوں نے اپنے دو بھائیوں کے نام کی ہے، وہ جائیداد ابھی میرے تایا کے زیرِ استعمال ہی ہے، میرے تایا عمر کے

(۱) وفی الشامیة کتاب الھبة ج:۵ ص:۶۸۸ یوخذ ویستأنس ذلک من العبارات الآتیة

قلت فقد ان أفاد انّ التلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدالّة علی التملیک کمن دفع لفقیر شیئًا وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشیء ..... الخ.

وفی بدائع الصنائع کتاب الھبة ج:۶ ص:۱۲۴ والاذن نوعان صریح ودلالة .... وامّا الدلالة فھی أن یقبض الموھوب لهٗ العین فی المجلس ولا ینھاہ الواھب فیجوز قبضه استحسانًا ..... الخ. وکذا فی شرح المجلّة کتاب الھبة رقم المادّة: ۸۴۲ ص: ۳۵۳ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ)۔ نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۲۶.

آخری حصے اور نہایت کمزوری اور ضعف میں ہیں، اس جائیداد کے بارے میں اب شرعی حکم کیا ہے؟ اور ان کی یہ جائیداد کس کی ہے؟ اور اس کا انتظام و دیکھ بھال کے بارے میں بھی آگاہ فرمائیں۔ ''جنگ'' اخبار میں آپ کے کالم نہایت ہی مفید اور پسند ہیں۔ کیا اسلام آباد اور راولپنڈی میں آپ کے والد صاحب کے کوئی خلیفہ ہیں؟

طلعت محمود راولپنڈی

جواب:- برادرِ عزیز و مکرّم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے تایا نے اگر اپنی ساری جائیداد اپنے دونوں بھائیوں کو دی ہے تو شرعاً یہ ہبہ اس لئے دُرست نہیں ہوا کہ دونوں بھائیوں کو الگ الگ کر کے دینا ضروری تھا،(۱) اور قبضہ بھی نہیں ہوا،(۲) لیکن چونکہ آپ کے تایا کی کوئی اولاد نہیں ہے، اور بیوی بھی نہیں ہے، اور بہن بھی نہیں ہے، تو آپ کے تایا کے شرعی وارث آپ کے والد اور چچا ہی ہیں، لیکن جب تک آپ کے تایا زندہ ہوں، اس وقت تک ان کی جائیداد کو انہی پر خرچ کرنا ضروری ہے، البتہ ان کی جائیداد کے انتظام کے معاوضے کے طور پر کچھ مناسب رقم دونوں بھائی لینا چاہیں تو اس کی گنجائش ہے۔

''جنگ'' کے کالم کی پسندیدگی کا شکریہ! دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اسے مفید بنائے۔ راولپنڈی اسلام آباد میں حضرت والد صاحبؒ کے کوئی خلیفہ تو نہیں ہیں، لیکن نواب قیصر صاحب اسلام آباد میں مقیم ہیں، جو حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ کے خلیفہ ہیں، ان کی ہفتہ وار مجلس بھی ہوتی ہے، مولانا عبداللہ صاحب جامعہ فریدیہ سے ان کا پتہ معلوم ہوسکتا ہے۔

والسلام

۲۸؍شعبان ۱۴۱۴ھ (۳)

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرائط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا غیر مشاع ممیّزا غیر مشغول ....الخ. وفی هامش مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۰ (طبع غفاریه) وفی الموهوب أن یکون مقبوضًا غیر مشاع ممیّزًا غیر مشغول وتتم بالقبض الکامل ....الخ.

وفی ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۲ (طبع سعید) وذکر قبله هبة المشاع فیما یقسم لا تفید الملک عند أبی حنیفةؒ وفی القهستانی لا تفید الملک وهو المختار کما فی المضمرات.

وفی خلاصة الفتاوی، کتاب الهبة، الفصل الثالث فیما یکون خطبا وفیما لا یکون ....الخ، ج:۴ ص:۳۹۰ (طبع مکتبه رشیدیه) ومن شرائط الهبة الافراز حتّی لا یجوز هبة المشاع فیما یحتمل القسمة کالبیت والدّار والأرض ونحوها وان کان لا یحتمل القسمة یجوز کالبئر والحمام والرحی ......الخ.

وفی البحر الرّائق، کتاب الهبة ج:۷ ص:۲۸۶ (طبع رشیدیه) .... فأفاد أنّه لو قبضه مشاعًا لا یملکه فلا ینفذ تصرّفه فیه لأنّها هبة فاسدة مآلاً وهی مضمونة بالقبض ولا تفید الملک للموهوب له وهو المختار.

وکذا فی مجمع الأنهر، کتاب الهبة ج:۳ ص:۴۹۴ (طبع غفاریه کوئٹه) وشرح المجلّة للاتاسیؒ ج:۳ ص:۳۷۸ (طبع حقانیه پشاور).

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) یہ جواب حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائلِ موصوف کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔ (محمد زبیر حق نواز)

گھر کے استعمال کے لئے دی گئی رقم سے بچا کر زیور بنایا گیا ہو تو کس کی ملکیت ہے؟

سوال:- شوہر اگر اپنی بیوی کو گھر کا انتظام چلانے کے لئے روپے دیتا ہے اور بیوی ان پیسوں میں سے بچا کر زیور یا نقدی جمع کرلیتی ہے، بیوی کے انتقال کے بعد ایسا مال شوہر کا ہے یا نہیں؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- شوہر اپنی بیوی کو گھر کے انتظام کے لئے جو رقم دیتا ہے اگر وہ اس نیت کے ساتھ دی تھی کہ بیوی سے حساب نہیں لوں گا، بلکہ جو کچھ بچ جائے وہ بیوی کی ملکیت ہے، تب تو بچی ہوئی رقم سے خریدا ہوا زیور بیوی کی ملکیت تھا، اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ترکے میں شامل ہوکر اس کے تمام شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا، اور اگر شوہر نے بیوی کو اس بات کا پابند کیا تھا کہ وہ حساب رکھے اور جو رقم بچے وہ واپس کرے تو پھر یہ زیور شوہر کی ملکیت تھا، اور اگر اس نے بیوی کو ہبہ نہیں کیا تو وہ اس کے انتقال کے بعد واپس لے سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۴۴ ب)

محض کاغذی طور پر جائیداد کسی کے نام کرنے یا کسی کے نام سے خریدنے کی شرعی حیثیت

سوال:- ایک صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، اُنہوں نے کچھ جائیداد اپنے لڑکوں کے نام سے لی تھی، جبکہ لڑکے چھوٹے تھے، اب لڑکے یہ کہتے ہیں کہ جب سے والد صاحب نے یہ چیزیں ہمارے نام خریدی تھیں اب ہم اُن کے مالک ہیں، والد صاحب کی کوئی تحریر ان کے نام سے نہیں ہے، اب یہ جائیدادیں کس طرح تقسیم ہوسکتی ہیں؟

جواب:- محض کاغذی طور پر کوئی جائیداد کسی کے نام لکھ دینے یا کسی کے نام خریدنے سے تو ہبہ ثابت نہیں ہوتا،[1] البتہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ والد مرحوم نے اپنی زندگی میں یہ جائیداد زبانی طور پر کسی خاص اولاد کو ہبہ کردی تھی اور اس اولاد نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو اس جائیداد کو اُسی مخصوص اولاد کی ملکیت سمجھا جائے گا،[2] وہ والد مرحوم کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی،[3] تحریری ہبہ نامہ ہونا بھی

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۶۹۲ وتتم الهبة بالقبض الکامل. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحکمها ثبوت الملک للموهوب له غیر لازم. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

ضروری نہیں، زبانی ہبہ[1] کا ثبوت گواہوں سے ہوجائے تو وہ بھی کافی ہے،[2] لیکن اگر زبانی ہبہ[3] کا بھی ثبوت نہ ہو تو پھر یہ جائیداد والد مرحوم کے ترکے میں شامل ہوکر تمام ورثاء میں بحصۂ رسدی تقسیم ہوگی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۶/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۰/۲۸ ج)

خصوصی خدمت اور تیمارداری کی بناء پر دیگر ورثاء کی رضامندی سے اپنا مکان صرف خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- اب سے تقریباً چار سال قبل میں فالج میں مبتلا ہوا تھا، اس بے بسی اور بیماری کی حالت میں میرے ایک بیٹے حفیظ الرحمٰن خان نے سعادت مندی کا ثبوت دیا، پیشاب، پائخانہ خود صاف کرتا تھا، (میری بیوی انتقال کرچکی تھی) اور اپنے روپے سے سینکڑوں روپے کا علاج کرایا، اس عمل سے خوش ہوکر میں نے اپنا رہائشی مکان جو میں نے دسمبر ۱۹۴۹ء میں پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا، اُس کو اِنعام کے طور پر دے دیا، ایسا کرنے سے پہلے میں نے اپنی دیگر اولاد سے جو میری مزاج پُرسی کے لئے آیا کرتے تھے رائے لی تھی، انہوں نے رضامندی ظاہر کردی، اور کہا کہ اس کا یہی لڑکا مستحق ہے، یہ فروری ۱۹۷۴ء میں ہوا، اور مزید یہ بھی کیا کہ روزانہ اخبار میں اعلانِ عام کرادیا کہ میں اپنا ذاتی مکان اپنے لڑکے حفیظ الرحمٰن خان کو اِنعام کے طور پر دے رہا ہوں، اگر کسی کو کوئی عذر ہو تو ۱۵ دن کے اندر عذر پیش کرے، ورنہ اس کے بعد کوئی عذر قابلِ قبول نہ ہوگا۔ کوئی اعتراض کسی کا وصول نہیں ہوا، لہٰذا قانونِ مروّجہ کے مطابق اُس کی پختہ کارروائی کرالی اور مکان کا قبضہ بھی دے دیا، جس پر اوتھ کمشنر اور گواہوں وغیرہ کے دستخط گواہی ثبت ہوگئی۔ یہ فروری ۱۹۷۴ء میں مکمل ہوگیا، اور مکان کا لیز بھی اُسی کے نام اب ہوگیا ہے، میں اب بھی اُسی مکان میں رہتا ہوں اور اسی لڑکے کی زیرِ کفالت ہوں، ہر قسم کا ٹیکس وہی ادا کرتا ہے اور مکان کی بقدرِ ضرورت مرمت اُسی نے کرائی ہے۔

میرے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، سب کی شادیاں ہوچکی ہیں سوائے ایک لڑکے کے، جس کی شادی بوجہ کمزوریٔ دماغ اور بوجہ آمدنی نہ ہونے کے انکار کردیا ہے، سب لڑکیوں کو رسم و رواج کے مطابق ہزاروں کا زیور و دیگر سامان اور کپڑے اپنے روپے سے کئے ہیں، میرے پاس اب سوائے

(۱و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) فی الدّر المختار، کتاب الدعوی ج:۵ ص:۵۵۳ (طبع سعید) وعدھا فی الأشباہ سبعًا بینۃ واقرار ویمین ونکول عنہ ..... وکذا ادعیٰ دینًا أو عینًا علی وارث اذا علم القاضی کونہ میراثًا أو اقر بہ المدعی أو برھن الخصم علیہ فیحلف علی العلم ولو ادعی ھما ای الدین والعین الوارث علی غیرہ یحلف المدعی علیہ علی البتات کموھوب وشراء درر ....الخ.

کفن دفن کے اخراجات کے کچھ نہیں بچا، اب سوال یہ ہے کہ میرے انتقال کے وقت اس مکان پر کسی کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ آپ نے دیگر ورثاء کی رضامندی بھی حاصل کرلی ہے تو آپ کے لئے اس مکان کا اپنے خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کردینا جائز بھی ہے،[1] اور جب بیٹے کو اس کا مالک و قابض بنادیا گیا تو یہ ہبہ شرعاً نافذ بھی ہوگیا۔[2] اب حفیظ الرحمٰن خان ہی اس مکان کا مالک ہے،[3] اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے دُوسرے ورثاء کا اس میں حق نہیں ہوگا، اور نہ یہ مکان آپ کے ترکے میں شامل ہوسکے گا، لما فی الدر المختار: "لا بأس بتفضیل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار ..... ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز وأثم. (قلت: یعنی اذا لم یرض به ورثته الآخرون). (شامی ج:۴ ص:۵۱۳ کتاب الهبة)۔[4]

وفیه أیضًا: "وهبة مقعد ومفلوج وأشل ومسلول من کل ماله ان طالت مدته" وقال الشامی تحته: "لأنّه اذا تقادم العهد صار طبعًا من طباعه کالعمی والعرج، وهٰذا لأنّ المانع من التّصرّف مرض الموت وهو ما یکون سببًا للموت غالبًا، وانّما یکون کذٰلک اذا کان بحیث یزداد حالًا فحالًا الٰی أن یکون آخره الموت، وأما اذا استحکم وصار بحیث لا یزداد ولا یخاف منه الموت لا یکون سببًا للموت کالعمی ونحوه. (شامی کتاب الوصایا ج:۵ ص:۴۲۳)۔[5]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶/۷۲۸ ب)

(۱ و ۴) الدّر المختار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید)، وفی شرح معانی الآثار للطحاوی کتاب الهبة ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) وقد فضل بعض أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ورضی عنهم بعض أولادهم فی العطایا ....الخ. وراجع أیضًا أوجز المسالک کتاب الهبة، باب مالا یجوز من النّحل ص:۲۲۰ (طبع مکتبه مظاهر علوم) واعلاء السُّنن ج:۱۶ ص:۹۶ و۹۷ (طبع ادارة القرآن کراچی)
وفی الهندیة کتاب الهبة ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشیدیه) ولو وهب رجل شیئًا لأولاده فی الصّحة وأراد تفضیل البعض علی البعض عن أبی حنیفة أنه لا بأس به اذا کان التّفضیل لزیادة فضل له فی الدّین وعن أبی یوسفؒ أنه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بینهم وان کان فی ولده فاسق لا ینبغی أن یعطیه أکثر من قوته کیلا یصیر معینًا لهٗ فی المعصیة.
وفی البزازیة علیٰ هامش الهندیة الجنس الثالث فی هبة الصّغیر ج:۶ ص:۲۳۷ ولو وهب جمیع ماله من ابنه جاز وهو آثم نصّ علیه محمّد ولو خصّ بعض اولاده لزیادة رشده لا بأس به ....الخ.
وفی فتاوی القاضی خان علیٰ هامش الهندیة فصل فی هبة الوالد لولده ج:۳ ص:۲۷۹ وروی المعلّی عن أبی یوسفؒ انه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بینهم. وکذا فی البحر الرّائق کتاب الهبة ج:۷ ص:۲۸۸.
(۲ و ۳) وفی الدّر المختار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۲ وتتم الهبة بالقبض الکامل.
وفی بدائع الصنائع فصل وأمّا حکم الهبة ...الخ ج:۶ ص:۱۲۷ (طبع سعید) وأمّا أصل الحکم فهو ثبوت الملک للموهوب له فی الموهوب من غیر عوض ....الخ. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۵) الدّر المختار کتاب الوصایا ج:۶ ص:۶۶۰ (طبع سعید). (محمد زبیر حق نواز)

۱:- اولاد میں کسی کو زیادہ کسی کو کم دینے کا حکم اور مشترکہ کاروبار سے حاصل شدہ رقم سے کاروبار کے غیر شریک بیٹے کو محروم کرنے کا حکم
۲:- زندگی میں علیحدہ ہوجانے والے بیٹے کو بھی میراث سے حصہ ملے گا

سوال۱:- ایک باپ جس کے تین بیٹے ہیں، وہ سب شادی شدہ ہیں، بڑا لڑکا سرکاری ملازم ہے، باقی دو لڑکے اور والد صاحب نے مل کر ایک دُکان کی، سب اِکٹھے ہیں، والد صاحب کی کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہے، صرف رقم کی صورت میں موجود ہے، اب والد صاحب نے ناراضگی کے بغیر بڑے لڑکے کو علیحدہ کردیا، مگر علیحدگی کے وقت جمع شدہ رقم میں سے کچھ نہیں دیا، اور ساری رقم ان کے لئے مخصوص کردی جو ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، کیا یہ بات والد صاحب کے لئے جائز ہے کہ ایک بھائی کو بلاوجہ محروم کردیں اور دو بھائیوں کو سب کچھ دے دیں؟

سوال۲:- والد صاحب کے فوت ہونے کے بعد کیا صورت ہوگی جبکہ لڑکا بہت پہلے علیحدہ ہوچکا ہے، اور پھر اس کے بعد دونوں لڑکے اور والد اِکٹھے کام کرتے رہے ہوں، کیا سب کو برابر تقسیم ہوگا یا دونوں بھائیوں کی ذاتی محنت شمار ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مناسب تو یہ تھا کہ باپ کاروبار کے اپنے حصے سے کچھ رقم تیسرے بیٹے کو بھی دیتا، لیکن باپ نے اگر اپنے بڑے لڑکے کو جمع شدہ رقم میں سے کچھ نہیں دیا تو اس میں اُس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ یہ رقم دُوسرے لڑکوں کے ساتھ کئے ہوئے کاروبار سے حاصل شدہ تھی، اور زندگی میں اگر کسی اولاد کو کم، کسی کو زیادہ دیا جائے تو جب تک وہ بدنیتی سے نقصان پہنچانے کا مقصد نہ ہو تو گنجائش ہے، وفی الخانیة: "لا بأس بتفضيل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب، وكذا فی العطايا ان لم يقصد به الاضرار وان قصده يسوّى بينهم." (شامی ج:۴ ص:۵۱۳ کتاب الھبة)[۱]۔

جواب۲:- والد صاحب کی وفات کے وقت جو رقم یا جائیداد ان کی ذاتی ملکیت ہوگی، وہ تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگی، اس میں بڑے لڑکے کو بھی حصہ ملے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۱۰۶۴ ج)

---

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید) نیز دیکھئے ص:۴۴۷ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۴۔

مرض الوفات سے قبل ہبہ کی گئی رقم موہوب لہٗ کی ملکیت ہے

سوال:- (خلاصۂ سوال) کمنا مرحوم نے اپنے مرتے وقت کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد نہیں چھوڑی۔ نور محمد، کریم الدین دونوں بھائیوں نے بھی کل زندگی میں کوئی بھی جائیداد نہیں بنائی ہے، دونوں بھائی ہر وقت اور ہمیشہ لڑتے رہے، اور ایک دُوسرے سے جدا رہے، کمائی بھی ہر ایک کی الگ ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو کریم الدین انتقال کرگیا، کریم الدین کی ایک لڑکی ہے، جس کو وہ بہت محبوب رکھتا تھا، زندگی بھر اس لڑکی کے ہاں رہا اور پوری زندگی میں یہی کہتا رہا کہ میرا تمام مال میری اس لڑکی کا ہے، مرحوم کے دو ہزار روپے نقد اس لڑکی کے پاس تھے، انتقال کے بعد کریم الدین کا بھائی لڑکی کے پاس آیا، تو لڑکی نے وہ دو ہزار روپے لاکر اس کو کہا کہ یہ روپے آپ لے لیں، اس پر نور محمد بھائی کریم نے کہا کہ: یہ تمہارا مال ہے، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ: اب تک تمہاری خدمت والد کر رہے تھے اور اب میں کروں گا۔ اس تمام ماجرا کے دس بارہ آدمی گھر کے شاہد ہیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر کریم الدین نے اپنی زندگی میں واقعۃً یہ دو ہزار روپے کا اپنی لڑکی کو ہبہ کردیا تھا اور لڑکی نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو وہ شرعاً اس کی ملکیت ہوگیا،[1] دُوسرے وارثوں کا اس میں حق نہیں، بشرطیکہ یہ روپے کریم الدین نے مرضِ وفات سے پہلے ہبہ کئے ہوں۔[2]

واللہ اعلم بالصواب
۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۱۹/۱۸ الف)

مرحوم کے انتقال کے بعد ملنے والے ”ہبہ نامہ“ کی حیثیت اور چند ورثاء میں تقسیمِ میراث کا طریقہ

سوال:- زید کی زندگی میں زید کی بیوی اور والدین کا انتقال ہوگیا تھا، زید نے دُوسری شادی کی، اس سے کوئی اور اولاد نہیں ہوئی، کچھ عرصہ بعد زید کا انتقال ہوگیا، مرحوم نے ورثاء میں ایک

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ وشرط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا ....الخ.
وفیه أیضًا ج:۵ ص:۶۹۲ وتتمّ الهبة بالقبض الکامل ....الخ.
وفیه أیضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحکمها ثبوت الملک للموهوب لهٗ غیر لازم.
وفی بدائع الصنائع فصل وامّا حکم الهبة ...الخ ج:۶ ص:۱۲۷ (طبع سعید) وأمّا أصل الحکم فهو ثبوت الملک للموهوب لهٗ فی الموهوب من غیر عوض. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۲) وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۰ وهب فی مرضه ولم یسلم حتّی مات بطلت الهبة. وفی شرح المجلّة للأتاسی واذا وهب واحد فی مرض موته شیئًا لأحد ورثته وبعد وفاته لم یجز سائر الورثة لا تصح تلک الهبة. وکذا فی الهدایة، کتاب الوصایا ج:۴ ص:۶۵۷. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

لاولد بیوہ، پہلی بیوی سے ایک لڑکی شادی شدہ، ایک بھائی اور دو بہنیں چھوڑی ہیں، مرحوم کے انتقال کے بعد یہ "ہبہ نامہ" ملا جو کہ اِستفتاء ھٰذا کے ساتھ منسلک کیا جارہا ہے، یہ "ہبہ نامہ" رجسٹری نہیں ہوا، جن گواہوں کے دستخط ہیں ان کا بیان ہے کہ ہمارے سامنے مرحوم نے کسی چیز کا بھی قبضہ نہیں دیا تھا اور جن کے نام ہبہ کیا تھا ان لوگوں نے بھی یہی بتایا ہے کہ اُن کو قبضہ نہیں دیا گیا تھا، ہبہ نامہ کے علاوہ بھی نقدی اور زیورات ہیں، مرحوم کی جائیداد کس طرح تقسیم کی جائے؟

جواب:- اگر مذکورہ جائیدادیں مرحوم نے اپنی بیٹی اور بیوی کو الگ الگ[1] کر کے قبضے میں نہیں دی تھیں، تو یہ ہبہ تام نہیں ہوا،[2] اور یہ تمام جائیدادیں بدستور مرحوم کی ملکیت میں رہنے کی بنا پر ان کے ترکے میں شامل اور دُوسرے مال کی طرح تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوں گی۔

لما فی الدر المختار: وتتم الهبة بالقبض الكامل. وفی ردّ المحتار تحته: فيشترط القبض قبل الموت ولو كانت فی مرض الموت للأجنبی كما سبق فی كتاب الوقف. (شامی ج:۴ ص:۵۱۰)[3]۔

اور صورتِ مسئولہ میں پہلے مرحوم کے ترکے سے ان کی تجہیز و تکفین کے درمیانہ درجے کے اِخراجات نکالے جائیں، پھر اگر ان کے ذمے کوئی قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے، اور بیوی کا مہر بھی اگر ابھی تک ادا نہ کیا ہو اور بیوی نے معاف بھی نہ کیا ہو تو وہ بھی قرض ہے، اسے ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کی ہو تو ⅓ کی حد تک اس پر عمل کیا جائے، پھر جو مال بچے اس کا آٹھواں حصہ مرحوم کی بیوہ کو، اور آدھا حصہ لڑکی کو دیا جائے، اور اس کے بعد جو مال باقی بچے اس کے چار حصے کر کے دو حصے بھائی کو اور ایک ایک حصہ دونوں بہنوں کو دے دیا جائے، سہولت کے لئے کل ترکے کے بتیس حصے کرلیں، جس میں سے بیوہ کو چار حصے، لڑکی کو سولہ حصے، بھائی کو چھ حصے اور ہر بہن کو تین تین حصے دے دیئے جائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۱۲ ج)

کسی شریک کا قابلِ تقسیم مشترکہ زمین کسی کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے میں کہ مسمیان جمعہ و عبدالرحیم پسران عبدالرحمٰن دو حقیقی بھائی ہیں، مسمّٰی عبدالرحیم نے اپنی زمین جو ابھی تک تقسیم نہ ہوئی تھی، بلکہ مشترک تھی،

---

(۱) دیکھئے ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱۔ (۲) دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۳) شامی كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۰ (طبع سعيد).

مسمّیٰ محبوب ولد عبداللہ چچازاد بھائی کو خفیہ ہبہ کردیا، لیکن رقبہ موہوبہ کا قبضہ موہوب لہٗ کو نہیں دیا، ہبہ کے بعد واہب تین سال تک زندہ رہا لیکن اس عرصے میں واہب نے موہوب لہٗ کو قبضہ نہیں دیا، بلکہ زمین حقیقی بھائی جمعہ کے قبضے میں رہی۔ مذکور کے فوت ہونے کے بعد بھی مسمّیٰ جمعہ نے محبوب موہوب لہٗ کو تقریباً تیرہ سال تک قبضہ نہیں دیا، اس سال موہوب لہٗ نے مسمّیٰ جمعہ برادر عبدالرحیم واہب جو اکیلا واہب کا وارث ہے، اس سے اس کے ضعیف العمر غریب اور بے کس ہونے کی وجہ سے جبراً قبضہ لے لیا، کیا یہ ہبہ شرعاً دُرست ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہبہ ایسی مشترک زمین کا ہوا ہے جو قابلِ تقسیم ہے، لیکن ہوئی نہیں، اور واہب نے قبضہ بھی نہیں دیا۔ مفصل و مدلل جواب عنایت فرماویں اس سال موہوب لہٗ نے مسمّیٰ جمعہ سے اس کا ذاتی رقبہ بھی چھین لیا جبکہ ہبہ کا صرف ایک ہی گواہ زندہ ہے، بینوا بالصواب توجروا بالثواب۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہبہ شرعاً دُرست نہیں ہوا،[1] زمین میں مسمّیٰ عبدالرحیم مرحوم کا جو حصہ تھا، وہ مرتے وقت تک اس کی ملکیت میں رہا، اور مرنے کے بعد اس کے شرعی ورثاء کی ملکیت ہوگیا، موہوب لہٗ مسمّیٰ محبوب نے عبدالرحیم کی وفات کے بعد زمین پر جو زبردستی قبضہ کیا، وہ شرعاً بالکل ناجائز اور حرام ہے، اس پر شرعاً واجب ہے کہ یہ زمین عبدالرحیم کے ورثاء کو واپس کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶/۱۴۰)

اصل مالک کی طرف سے کوارٹر پر قبضہ دِلائے بغیر محض الاٹمنٹ سے ملکیت نہیں آتی

سوال:- والد صاحب مرحوم نے بیرونِ ملک دو چلتی ہوئی کاروباری دُکانیں چھوڑی ہیں، اس کاروبار کو والدہ صاحبہ کی سرپرستی حاصل ہے، کراچی میں دو دُکانیں کرایہ کی چھوڑی ہیں، جو خالی پڑی ہیں، دو عدد کوارٹرز بھی چھوڑے ہیں جو گورنمنٹ سے الاٹ شدہ ہیں، ایک والدہ کے نام پر الاٹ ہوا ہے، دُوسرا بھائی کے نام پر الاٹ ہوا ہے، ان مذکورہ بالا دونوں کوارٹروں میں ایک دُوسرا بھائی (جس کے نام الاٹ نہیں ہے) مع اپنی بیوی بچوں کے رہ رہا ہے، ان رہائش پذیر کوارٹروں میں مقیم بھائی نے تعمیر پر کچھ رقم لگائی ہے، لہٰذا ترکے کا کیا حکم ہے؟ اور یہ دو کوارٹر جن کے نام پر الاٹ ہوئے ہیں وہ ان کے مالک ہیں یا والد مرحوم کی ملکیت تھے؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

(۱) حوالہ کے لئے ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب :- مرحوم کی یہ تمام دُکانیں اور دونوں کوارٹر مرحوم کے ترکے میں شامل ہوں گے، کوارٹروں کی قیمت مرحوم کے ذمے دَین ہے، وہ ترکے میں سے پہلے نکال کر گورنمنٹ کو دی جائے گی، اور محض کوارٹروں کے کسی کے نام الاٹ ہونے سے وہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک وہ ہے جس نے ان کوارٹروں کی خریداری کا معاملہ کیا، ہاں اگر مرحوم نے مذکورہ کوارٹروں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی تندرستی میں زبانی یا تحریری ہبہ کسی کے نام کردیا ہو اور اُس نے اُس کوارٹر پر قبضہ بھی کرلیا ہو تو وہ مالک ہوجائے گا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۰/۲۸ ج)

۱:- بیوی کے نام سے خریدی گئی زمین اور اُس پر تعمیر کی جانے والی کوٹھی بیوی کی ملکیت ہے

۲:- تحریری اسٹامپ کے ساتھ دی گئی رقم کا ہبہ دُرست ہے

۳:- کسی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرائی یا جائیداد خریدنے سے ہبہ دُرست ہوجاتا ہے

۴:- کسی کے نام سے جمع کرائی گئی رقم کی چیک بک پر قبضے سے ''ہبہ'' مکمل ہوگیا

۵:- بیوی اور لڑکیوں کی دستبرداری کے بعد کل جائیداد بیٹوں کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال ۱:- متوفی شوہر نے ایک قطعہ زمین اپنی بیوی کے نام سے کراچی میں خریدا، اس کے بعد اس کو فروخت کردیا، تو بیوی نے اعتراض کیا کہ آپ نے کیوں بیچ دیا؟ تو مرحوم شوہر نے فرمایا کہ: ''میں تمہارے لئے ایک پلاٹ حیدرآباد میں خرید دیتا ہوں'' اور مرحوم شوہر نے ایک پلاٹ زمین ''لطیف آباد'' (حیدرآباد) بیوی کے نام سے ہی خریدا اور بیوی کے نام ہی رجسٹری کرائی، اس کے بعد مرحوم شوہر نے مذکورہ پلاٹ پر کوٹھی تعمیر کرائی، دورانِ تعمیر بیوی سے کہا کہ: ''میں نے تمہارے لئے کوٹھی

---

(۱) تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص:۴۴۰ کے تمام حواشی اور ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

بنوادی ہے، تم عمر بھر اس میں رہنا" جب کوٹھی بالکل مکمل ہونے والی تھی تو شوہر کا انتقال ہوگیا، تو ایسی صورت میں کیا پلاٹ اور کوٹھی دونوں بیوی کی ملکیت ہوں گے یا صرف پلاٹِ زمین؟ یا اگر دونوں بیوی کی ملکیت نہیں ہوئیں تو کیا دُوسرے وارثوں میں تقسیم کردی جائے۔ (نوٹ: ابھی اس کوٹھی میں کوئی نہیں گیا تھا)۔

سوال۲:- بڑے لڑکے کو ۵۵ ہزار مروّجہ قانون کے تحت گفٹ کیا، جس میں ایک اسٹامپ تحریر کرنا پڑتا ہے کہ میرا لڑکا میری بہت خدمت کرتا ہے اس کو میں خوش ہوکر اپنے سرمائے میں سے اتنی رقم دے رہا ہوں، اور یہ رقم متوفی نے مندرجہ بالا طریق پر دے دی تھی، کیا یہ ہبہ ہوگئی؟

سوال۳:- چھوٹے لڑکے کو متوفی نے اس طرح رقم دی کہ اس کے نام سے بینک میں جمع کرادیئے، اور اس کے نام سے ایک تجارتی جائیداد خرید دی تھی، یہ رقم اور جائیداد ہبہ ہوئی کہ نہیں؟ اگر ہبہ نہیں ہوئی تو شاملِ ترکہ کرکے تقسیم کردیں؟

سوال۴:- بیوی کے نام بھی انہوں نے یعنی مرحوم نے بیوی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرادی تھی، یہ رقم ہبہ ہوئی کہ نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو شاملِ ترکہ کرکے تقسیم کردیں؟

سوال۵:- بہنوں نے اور والدہ نے زبانی یہ کہا کہ ہم اپنا حصہ اپنے دونوں بھائیوں اور والدہ اپنے دونوں لڑکوں کو ہبہ کرتی ہیں، تو کیا وہ ترکہ جو کہ اُن کو ملنے والا تھا، ہبہ ہوگیا؟ حساب کرکے لڑکیوں اور بیوی کو بتلادیا گیا تھا کہ تمہارا اتنا حصہ نکل رہا ہے، اگر ہبہ نہیں ہوا تو براہِ مہربانی ہبہ کا صحیح طریقہ تحریر کریں۔

جواب۱:- صورتِ مسئولہ میں زمین اور جس قدر کوٹھی متوفی کی وفات سے قبل تعمیر ہوئی تھی، بیوی کی ملکیت ہوگئی، بشرطیکہ زمین کا ہبہ مرضِ وفات سے پہلے ہوا ہو،[1] فقہی اِصطلاح میں اس مسئلے کی صورت یہ ہے کہ شوہر نے زمین بیوی کو ہبہ کی تھی، اس پر بیوی کی اجازت سے کوٹھی کی تعمیر بیوی کی طرف سے قبضہ ہے، جس سے ہبہ تام ہوگیا،[2] اور زمین بیوی کی ملکیت ہوگئی۔[3] اب بیوی کی طرف سے تعمیر کے تصرف کی اجازت اس شرط پر ہے کہ کوٹھی اس کی ہو، لہٰذا تعمیر کے لئے جتنا سامان خریدا گیا وہ بیوی کو نقد ہبہ کیا گیا اور اس کا زمین پر تعمیر میں لگنا بیوی کی طرف سے قبضہ ہوا، لہٰذا جس قدر کوٹھی تعمیر ہوئی اس پر قبضہ مکمل ہوکر بیوی کی ملکیت ہوگیا۔ اب قبضے کے لئے کوٹھی میں جاکر رہنا ضروری نہیں، شرط یہی ہے کہ کوٹھی بھی مرضِ وفات سے پہلے بنائی گئی ہو۔[4] واللہ اعلم

جواب۲:- صورتِ مسئولہ میں ہبہ منعقد ہوگیا، بشرطیکہ ہبہ مرضِ وفات میں نہ ہوا ہو۔[5]

(حواشی اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

جواب ۳:- اگر چھوٹے لڑکے نے جائیداد پر اور بینک کی چیک بک پر قبضہ کرلیا ہو تو ہبہ صحیح ہوگیا،[6] بشرطیکہ مرضِ وفات میں نہ ہو۔[7]

جواب ۴:- اگر بیوی نے چیک بک پر قبضہ کرلیا ہو، تو ہبہ منعقد ہوگیا، بشرطِ مذکور۔

جواب ۵:- اس ہبہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو وارث اپنا حصہ چھوڑنا چاہتے ہیں، وہ ترکے میں سے کوئی چیز مثلاً کپڑے لے کر اپنا باقی حصہ دُوسرے ورثاء کے لئے چھوڑ دیں، جسے تخارج کہتے ہیں۔[8]

نوٹ:- اولاد کو ہبہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب کا حصہ برابر ہو، خواہ مذکر ہوں یا مؤنث، لہٰذا بعض کو دینا اور بعض کو نہ دینا جس سے انہیں ضرر پہنچے، شرعاً ناجائز ہے،[9] لیکن اگر ایسا کر کے ہبہ کرنے والا فوت ہوچکا ہے تو ہبہ نافذ ہوگیا،[10] بشرطیکہ ہبہ مرض الوفات میں نہ ہوا ہو۔ واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲/۵/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۱۷/۱۸ الف)

سوتیلے بیٹے کی طرف سے والد کو قرض یا ہبہ کے طور پر بھیجی گئی رقم کا حکم

سوال:- ایک شخص نے پہلی شادی کی تھی، اس سے تین لڑکیاں ہیں، اور بیوی فوت ہوگئی، اُس کے بعد دُوسری شادی کی جس سے ایک لڑکی ہوئی اور بیوی فوت ہوگئی، تیسری شادی ایک بچے کی ماں سے کی، یعنی اُس عورت کا شوہر سے ایک لڑکا تھا، وہ ساتھ لے کر آئی تھی، بعد میں وہ بچہ چلا گیا۔

اس لڑکے نے پندرہ بیس سال بعد رقم بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ مکان خریدو اور خرچ کرو اور اچھی زندگی بسر کرو، حج کو جاؤ، اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرو۔ اب اس رقم سے سونا خرید لیا گیا، اس میں منافع ہوا، اور ایک رہائش کے لئے مکان خریدا گیا، اُس میں بھی منافع ملتا ہے، مکان میں مرحوم نے اپنی رقم بھی لگائی تھی، تیسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور وہ فوت ہوگئی، بیوی کے مرنے کے بعد شوہر بھی فوت ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ سوتیلے لڑکے نے جو رقم بھیجی تھی اُس کا کیا کیا جائے؟

(۱و۴و۵و۷) حوالے کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳ اور ص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲و۳و۶) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۸) حوالہ کے لئے دیکھئے السراجی فی المیراث ص:۶۲ (طبع مکتبہ سیّد احمد شہیدؒ لاہور)۔

(۹) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۴۷ کا حاشیہ نمبر ۱و۴۔

(۱۰) وفی الهندیة کتاب الهبة الباب السادس ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشیدیه) رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثمًا فیما صنع .... الخ. نیز دیکھئے حوالہ سابقہ۔

سوتیلے لڑکے نے جو رقم بھیجی تھی اُس کی کوئی تحریر بھی نہیں ہے کہ یہ رقم امانت ہے۔ دونوں شخصوں کے مرنے کے بعد لڑکا تحریر کرتا ہے کہ امانت ہے، اب تقسیم کے وقت دو بیویوں کی چار لڑکیاں ہیں اور ایک یہی سوتیلا لڑکا ہے، لہٰذا جو رقم آئی تھی اُس کا کیا جائے؟ اور مکان میں جو نفع ہوتا ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ اور سونے میں جو منافع ہوتا ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ اب لڑکیاں کہتی ہیں کہ یہ سب ہمارا ہے اور لڑکا کہتا ہے کہ یہ سب میرا ہے۔

تنقیح

نمبر۵ کے ضمن میں لکھا ہے کہ: ''لڑکے نے پندرہ بیس سال بعد رقم بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ مکان خریدو اور خرچ کرو'' اس بات کی وضاحت کریں کہ یہ رقم کس کو بھیجی تھی؟ اپنی ماں کو یا سوتیلے باپ کو؟ اور بھیجنے کا کیا مطلب ہے؟ جس کو بھیجی تھی اس کو اس کا مالک وقابض بنادیا تھا یا محض مکان خریدنے کے لئے بھیجی تھی اور مالک خود ہے؟

نمبر۶ میں یہ رقم جس سے سونا خریدا گیا کس کو بھیجی تھی؟ اور مالک وقابض بنایا تھا یا نہیں؟

نمبر۸ مرحومہ کے انتقال کے وقت اس کے والدین زندہ تھے یا نہیں؟ اور ان کے علاوہ کون کون سے رشتہ دار زندہ تھے؟ اور کیا اس کی میراث تقسیم ہوچکی ہے یا نہیں؟

جوابِ تنقیح

نمبر۵ رقم تو باپ کے نام آئی تھی، مگر ماں باپ دونوں کے خرچے کی تھی، اور لکھا تھا کہ آپ مکان خرید کر اُس میں آرام سے دونوں آباد ہوجائیں، اس کی ملکیت سے لڑکے کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

نمبر۶ سونا خریدنے کی علیحدہ رقم کوئی نہ تھی، مکان خریدنے کے لئے جو رقم تھی وہ ہی پڑی تھی، اُس سے سونا خرید لیا تاکہ منافع ہوکر رقم بڑھ جائے اور اچھا مکان لے لیں۔

نمبر۸ والدین مرحومہ کی زندگی میں وفات پاگئے تھے، مرحومہ نے لاولد وفات پائی، البتہ پہلے خاوند سے وہ لڑکا موجود ہے جو برما میں آباد ہے، اور جس نے اپنی حقیقی ماں اور سوتیلے باپ کے آرام کی خاطر رقم بھجوائی تھی، مگر اس سے مکان خریدا نہیں گیا، جبکہ وہ خریدِ مکان کی غرض سے تھی، مگر اس سے سونا خرید کر نفع کمایا جو بڑی رقم میں تبدیل ہوگئی۔ اب لڑکے کو جب سگی ماں اور سوتیلے باپ کی وفات کی خبر ملی اور پتہ چلا کہ میں نے جو رقم خریدِ مکان کے لئے بھجوائی تھی اُس کو سونا خرید کر منافع حاصل کیا ہے تو وہ اپنی رقم کا دیگر وارثان سے یہ کہہ کر مطالبہ کرتا ہے کہ یہ تو میں نے امانت کے طور پر جمع رکھنے کے لئے بھجوائی تھی، اب جھگڑا صرف یہ ہے کہ یہ رقم اُسے واپس کی جائے یا ترکے میں تقسیم کی جائے جس میں یہ بھی بقدرِ حصہ خود حق دار ہوگا۔

اس لڑکے کی حقیقی ماں پہلے فوت ہوئی اور سوتیلا باپ بعد میں فوت ہوا ہے، نیز واضح ہو کہ اب یہ رقم جس سے سونا خرید کر نفع کمایا تھا، ایک مکان کی خریداری میں لگ گئی ہے، جس میں سوتیلے باپ نے بھی کچھ رقم اپنی ڈال کر مکان خرید لیا تھا، جسے اپنی بیوی کے نام خریدا تھا وہ اس لڑکے کی حقیقی ماں ہے، اسی میں اُن کی سکونت تھی، اس لڑکے نے رقم بھجواتے وقت امانت کا لفظ نہیں لکھا تھا، اب امانت بتاتا ہے۔

تفصیل وارثان:- مرحومہ کی وفات کے وقت دُوسرا خاوند زندہ تھا، ایک پہلے خاوند کا لڑکا تھا (جس کی رقم کا جھگڑا ہے)، اور دُوسرے خاوند کی پہلی اور دُوسری بیویوں کی چار لڑکیاں تھیں، بعد میں خاوند کا انتقال جب ہوا تو اُس کی پہلی دو بیویوں سے چار لڑکیاں خاوند کے صلب سے موجود تھیں، اور تیسری بیوی کا پہلے خاوند سے ایک لڑکا تھا جو برما میں تھا۔ اس لئے ترکے میں ایک مکان جو تیسری بیوی کے نام سے خریدا تھا چھوڑا اور کچھ نقد رقم چھوڑی ہے، سوال جواب طلب یہ ہے کہ اس کے ترکے کی تقسیم کیسے ہوگی؟ بیوی کے نام خریدا ہوا مکان مرحومہ بیوی کا لڑکا مانگتا ہے جسے مرحوم کی لڑکیاں دینے پر رضامند نہیں ہیں، وہ کہتی ہیں کہ یہ تو ہمارے باپ کا ہے، جبکہ وہ بیوی کے نام سے خریدا تھا اور اس میں بڑی رقم بیوی کے لڑکے کی ہے، تھوڑی رقم مرحوم کی لگی ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر رقم بھیجنے والا لڑکا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے جو رقم بھیجی تھی وہ قرض کے طور پر بھیجی تھی، ہبہ کے طور پر نہیں، تو اس کا قول معتبر ہوگا، اور یہ رقم اس لڑکے کو واپس کی جائے گی، مرحوم یا مرحومہ کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، لما فی ردّ المحتار: "ولو دفع دراهم وقال: أنفقها عليك، يكون قرضًا" (ج:۴ ص:۵۰۹)۔[1] وفيه أيضًا: "دفع دراهم الیٰ رجل وقال: أنفقها، ففعل فهو قرض....." (وفيه أيضًا): رجل اشترى حليا ودفعه الى امرأته واستعملته ثم ماتت ثم اختلف الزوج وورثتها أنها هبة أو عارية فالقول قولُ الزوج مع اليمين أنّه دفع ذٰلک اليها عارية لأنّه منكر للهبة" (ج:۴ ص:۵۲۲)۔[2]

البتہ یہ حکم صرف اتنی رقم کا ہے جو لڑکے نے بھیجی تھی، اس رقم کو تجارت میں لگا کر جو نفع حاصل ہوا وہ لڑکے کا نہیں ہے، بلکہ جس کو اس نے قرض دیا تھا اُس کا ہے،[3] اس سے معلوم کیا جائے کہ

---

(۱) ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۹ (طبع سعيد) وفی الهندية ج:۴ ص:۳۷۵ (طبع رشيديه) رجل عنده دراهم لغيره فقال له صاحب الدراهم: اصرفها فی حوائجک، کان قرضًا.....الخ.

(۲) ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۱ (طبع سعيد).

(۳) کیونکہ قرض لینے کے بعد مستقرض قرض کا مالک ہوجاتا ہے، اور قرض کی رقم اور اُس کا نفع اُسی کی ملکیت ہوتا ہے، حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۰۱ کا حاشیہ نمبرا۔

اس نے یہ قرض اپنی حقیقی ماں کو دیا تھا یا سوتیلے باپ کو؟ یا دونوں کو نصف نصف؟ پہلی صورت میں یہ نفع ماں کے ترکے میں شامل ہوگا، دُوسری صورت میں باپ کے ترکے میں، اور تیسری صورت میں نصف ماں کے ترکے میں اور نصف باپ کے ترکے میں شامل ہوگا، اسی طرح مکان میں جو رقم باپ نے خود لگائی تھی وہ بھی اس کے ترکے میں شامل ہوگی۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب ماں کے انتقال کے وقت اگر اس کا کوئی اور رشتہ دار زندہ نہ تھا، تو اس کی کل متروکہ جائیداد و ساز و سامان میں سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کے اِخراجات نکالے جائیں، پھر اگر اس کے ذمے کوئی قرضہ ہو تو اسے ادا کیا جائے، پھر کوئی جائز وصیت کی ہو تو اُسے ۱/۳ کی حد تک نافذ کیا جائے، اس کے بعد اُس کے کل ترکے کو چار مساوی حصوں پر تقسیم کرلیں، ان میں سے ایک حصہ مرحومہ کے شوہر کا ہے، اور باقی تین حصے اُس کے حقیقی لڑکے کے ہیں جو برما میں مقیم ہے، اور اس کی سوتیلی بیٹیاں اس کی وارث نہیں ہیں۔

اور باپ کے انتقال کے وقت اگر اس کا کوئی اور رشتہ دار زندہ نہیں تھا تو تجہیز و تکفین، قرضوں کی ادائیگی، اور وصیت کے نفاذ کے بعد جتنا بھی مال ہو (اور اس میں اپنی مرحومہ بیوی کے ترکے سے ملنے والا ۱/۴ حصہ بھی شامل ہے) اُسے مرحوم کی تمام لڑکیوں میں برابر تقسیم کردیا جائے، مرحوم کا سوتیلا بیٹا جو برما میں ہے، مرحوم کا شرعی واث نہیں ہے۔ یہ تفصیل اس وقت ہے جب مرحوم کا کوئی بھی رشتہ دار بیٹیوں کے سوا زندہ نہ ہو، اور اگر کوئی دُوسرا رشتہ دار مثلاً چچا، بھتیجا، ماموں، بھانجا، پھوپھی وغیرہ موجود ہو تو یہ مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیں۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۹/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۰/۲۸ ج)

۱:- ورثاء کے امیر یا غریب ہونے کی صورت میں کل جائیداد کسی کو ہبہ یا وقف کرنا

۲:- متبنّیٰ (لے پالک) شرعاً وارث نہیں ہے

سوال:- میں لاولد ہوں اور میری کوئی اولاد نہیں ہے، میری زوجہ کا انتقال ۱۹۶۵ء میں میری زندگی میں ہوگیا، میرے کوئی بھائی یا بہن نہیں ہے اور نہ کبھی تھا، ایک مختصر شجرہ قلم بند کرتا ہوں:-



میری بیوی کے رشتے کی بہن (ماموں زاد بہن) کا لڑکا سیّد افسر علی ہے، جسے اُنہوں نے اور میں نے متبنّیٰ کیا جو معہ اپنے اہل وعیال کے میرے ساتھ رہتا ہے، میری ضعیف العمری میں میری ہر طرح خدمت کرتا ہے۔ میری جائیداد میری وفات کے بعد ان کو کس حصے میں پہنچتی ہے؟ دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی جائیداد کا کچھ حصہ کلی طور پر اپنی زندگی میں دینا چاہتا ہوں، اگر کل جائیداد کسی کو دُوں یا وقف کروں تو اس میں کوئی اِشکال ہے؟

جواب:- اس سوال کا جواب یہ معلوم ہونے پر موقوف ہے کہ معصومن، مقبولن اور طفیلن مرحومات کی اولاد کی اولاد کی تفصیل کیا ہے؟ ان کے ہندوستان میں ہونے سے فرق نہیں پڑتا، اگر آپ کی کوئی خالہ، ماموں یا ان کی اولاد موجود ہو تو ان کی صراحت بھی ضروری ہے، آپ کی پھوپھیوں کی اولاد کی اولاد؟

بہرصورت اگر آپ کے ورثاء مالی اعتبار سے مستحکم ہوں تو آپ کے لئے جائز ہے کہ اپنی زندگی میں مرضِ وفات سے پہلے پہلے اپنی پوری جائیداد کسی کو ہبہ کردیں، یا وقف فرمادیں، لیکن اگر وہ مالی اعتبار سے کمزور اور نادار ہوں تو پوری جائیداد کسی کو دینا دُرست نہیں، کم از کم دو تہائی حصہ ورثاء کے لئے چھوڑ کر ایک تہائی حصہ وقف یا ہبہ کردیں، یا یہ وصیت کرجائیں کہ میری وفات کے بعد فلاں شخص کو دے دیا جائے۔

ویؤخذ ذٰلک من ردّ المحتار حیث قال: ان کانت الورثۃ فقراء ولا یستغنون بما یرثون فالترک أوْلیٰ ..... وان کانوا أغنیاء أو یستغنون بنصیبھم فالوصیۃ أوْلیٰ .....

فالتفصيل انما هو فى الكبار اما الصغار فترک المال لهم أفضل ولو كانوا أغنياء. (شامی ج:۵ ص:۴۷۳)۔[۱]

اور جن صاحب کو آپ نے متبنّیٰ بنایا وہ آپ کے وارث نہیں، البتہ آپ زندگی میں اُن کو اُن کی خدمت کی مکافات میں جو رقم یا جائیداد مناسب سمجھیں دے سکتے ہیں، اور ایک تہائی مال کی حد تک ان کے حق میں وصیت بھی کر سکتے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۵/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۲۴/۲۹ ب)

قبضے کے ساتھ جائیداد کسی کو دینے سے ہبہ دُرست ہوگیا اگرچہ کاغذات میں واہب کا نام ہو

سوال:- شیر محمد کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، شیر محمد نے اپنی مملوکہ ومقبوضہ زمین ومکانات اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کردیئے اپنی وفات سے تقریباً بارہ سال قبل، تقسیم کر کے اُن کو مالک وقابض بنادیا، سرکاری کاغذات میں زمین والد ہی کے نام تھی صرف موقع پر تقسیم کر کے قبضہ دے کر مالک بنادیا تھا، اس جائیداد میں بہنیں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ شیر محمد مرحوم نے اپنی زندگی میں بحالت تندرستی اپنی جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے ان کو مالک وقابض بنادیا تھا تو یہ ہبہ صحیح ہوگیا،[۲] مذکورہ بیٹے اس جائیداد کے مالک ہوگئے،[۳] اور شیر محمد کی وفات کے بعد اس کے دیگر ورثاء کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں، محض کاغذی طور پر جائیداد کے شیر محمد کے نام ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۹/۲۸ ج)

محرم کو ہبہ کرنے کے بعد رُجوع نہیں ہوسکتا

سوال:- والد نے اپنی زندگی میں اپنی املاک بطور ہبہ اپنی اولاد لڑکے اور لڑکیوں میں تقسیم کردی، اب یہ اولاد اس ملکیت پر فرداً فرداً قابض ومتصرف ہیں، اس اولاد میں اسی ملکیت کے انتظامیہ کاروبار میں کچھ بالاشتراک کاروبار بھی ہیں، ان اشتراکی معاملات میں بعض صرف اپنے ذاتی مفاد کا خیال رکھتے ہیں، خواہ دُوسروں کا اس میں نقصان ہی ہو، ان معاملات میں ان کے والد نے بطور تحفظ حقوقِ

---

(۱) ردّ المحتار على الدر المختار، كتاب الوصايا ج:۶ ص:۶۵۱، ۶۵۲.
(۲و۳) دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲و۳۔

مساوات تجویزیں پیش کیں کچھ نے قبول کیں، کچھ نے انکار کردیا، یہاں تک کہ اولاد کے خلاف عملی کوشش بھی کی گئی، ایسی حالت میں والد صاحب کو اپنی موہوب ملکیت واپس لینے کا اختیار ہے یا نہیں؟

جواب:- جب والد نے اپنی املاک اپنی اولاد کو ہبہ کردی اور اُنہوں نے اُس پر قبضہ بھی کرلیا تو ہبہ تام ہوگیا،[1] اب باپ کو شئ موہوب کے واپس لینے کا اختیار نہیں، فلو وهب لذی رحم محرم منه لا یرجع، کذا فی التنویر مع الشامی ج:۴ ص:۵۱۸۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۱/۲۸ ب)

ہبہ سے رُجوع دُرست نہیں

سوال:- میں یعنی حقیقی والد نے اپنا ایک ہی مکان اپنے پسر کے نام ہبہ کیا ہو، اور اپنی بزنس اور دُکان بلامعاوضہ پسرِ مذکور کے نام کردیا ہو تحریری، اور عرصہ آٹھ سال سے اُس کی انکم سے محروم رہا ہوں، میری سیکنڈ وائف سے چار بچے ہیں، اِن حالات کے پیشِ نظر اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد واپس لینا چاہتا ہوں، کیا شرعاً اُس کا واپس لینا میرے لئے جائز ہے؟

جواب:- جب آپ نے اپنا مکان، دُکان اور کاروبار باقاعدہ اپنے بیٹے کو ہبہ کردیا، اور بیٹے نے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے تو اَب آپ کو واپس لینے کا اختیار نہیں رہا، فلو وهب لذی رحم محرم منه نسبًا ولو ذمّیا أو مستأمنًا لا یرجع. (شامی ج:۴ ص:۵۱۸)۔[3] البتہ آپ کے بیٹے کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ آپ کی ضروریات کا خیال رکھے، اور آپ سے صلۂ رحمی کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۲/۲۸ ب)

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) الدّر المختار مع ردّ المحتار، کتاب الهبة، باب الرّجوع فی الهبة ج:۵ ص:۷۰۴ (طبع سعید).
وفی صحیح البخاری، کتاب الهبة، باب الهبة للمشرکین ج:۱ ص:۳۵۷ (طبع قدیمی) عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لیس لنا مثل السوء الّذی یعود فی هبته کالکلب یرجع فی قیئه.
وفی الهدایة، کتابُ الهبة، باب ما یصحّ رجوعه وما لا یصحّ ج:۳ ص:۲۹۲ (طبع مکتبه رحمانیه، وفی طبع مکتبه شرکت علمیه ج:۳ ص:۲۹۰) وان وهب هبة لذی رحم محرم منهُ لم یرجع فیها لقوله علیه السلام: "اذا کانت الهبة لذی رحم محرم لم یرجع فیها" (رواه البیهقی) وکذا فی مجمع الأنهر، باب الرجوع ج:۳ ص:۵۰۳ (طبع غفاریه کوئٹه).
وفی الهندیة ج:۴ ص:۳۸۶ (طبع رشیدیه) والبحر الرّائق، کتاب الهبة ج:۷ ص:۲۹۴ (طبع سعید) والبدائع ج:۶ ص:۱۳۲ (طبع سعید) وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۸۶۶ کتاب الهبة، باب ثالث ج:۱ ص:۴۷۶ (طبع حنفیه کوئٹه) من وهب لاصوله وفروعه أو لأخیه أو اخته أو لأولادهما أو لعمه أو لعمته أو لخاله أو لخالته شیئًا فلیس له الرجوع.

(۳) الدّر المختار مع ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۷۰۴ (طبع سعید).
نیز دیکھئے سابقہ حاشیہ۔

شرم و مروّت میں کئی دن تک کھانا کھلایا پھر اس کے بدلے رقم طلب کی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید نے بکر کو کچھ رقم قرض کے طور پر دی، زید کے پاس بکر کے بچے بھی زیرِ تعلیم تھے، بکر زید کو کھانا دیتا رہا، کچھ عرصہ بعد بکر نہایت مفلس بن گیا اور ساتھ ہی ساتھ بیمار بھی ہوگیا، بکر پر ایسے حالات آئے کہ محلے کے ہر جاننے والے شخص سے قرض لیا حتیٰ کہ سود پر بھی قرض لیا، اسی دوران بکر نے زید کو بار بار کہا کہ وہ اپنا انتظام کرلے کیونکہ وہ کھانا دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا، مگر زید آنکھیں بند کرکے بکر کے گھر کھانا کھاتا رہا، اگر کسی دن کھانا نہیں پہنچتا تھا تو بکر کے گھر جاکر مطالبہ کرتا تھا۔

بکر کا کہنا ہے کہ میرے بار بار کہنے کے باوجود جب زید میرے گھر کھانا کھاتا تھا تو میں صرف اہلِ محلّہ اور اقارب میں شرمندگی کی وجہ سے گھر سے کھانا بھیجتا رہا، کچھ دنوں کے بعد زید نے اپنے قرض کا مطالبہ کیا، مطالبے پر بکر نے کچھ رقم دے دی اور کچھ رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا، مگر زید نے پوری رقم یا آدھی رقم کا دوبارہ مطالبہ کیا، اور بات شرمندہ کرنے تک پہنچ گئی، اس پر بکر نے یہ کہا کہ جب سے میں نے تمہیں کھانا کھانے کا اپنا انتظام کرنے کا نوٹس دیا تھا اس کے بعد کے دنوں کے کھانے کی رقم میرے حوالہ کردو، کیونکہ اس میں مجھے نہ تو ثواب کی نیت تھی اور نہ میں نے اپنی خوشی سے کھلایا، صرف عزّت بچانے کی خاطر دیتا رہا۔

کیا بکر کا یہ مطالبہ شرعاً دُرست ہے کہ نوٹس کے بعد کے دنوں کے کھانے کی رقم دو؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر بکر زید کے گھر اس لئے کھانا کھاتا تھا کہ زید اس کا مقروض تھا، اور قرض کی وجہ سے زید اسے کھانا کھلاتا تھا تب تو یہ کھانا سود کے حکم میں ہوکر حرام ہوا[1]، اور اس کی قیمت قرض سے منہا کرنی ضروری ہے، لیکن اگر کھانا قرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ پہلے سے باہمی تعلق کی بنا پر کھلاتا تھا تو جب بکر نے زید کو اپنے گھر کھانے سے منع کردیا تھا تو زید کے لئے جائز نہیں تھا کہ اُس کے گھر کھانا کھاتا، لقولہ علیہ السلام: ''لا یحلّ مال امریء مسلم اِلّا بطیب نفس منہ''۔[2] اور بکر کی مرضی کے خلاف اس کے گھر کھانا کھاکر زید نے گناہ کا ارتکاب کیا، اس گناہ کی تلافی کے لئے دیانۃً زید پر واجب ہے کہ جتنے دن بکر کی مرضی کے خلاف اُس کا کھانا کھایا ہے اُتنے دن کے کھانے کی قیمت اس کو اَدا کرے، لیکن چونکہ بکر نے اس کو کھانا اپنے اختیار سے دیا ہے، خواہ لوگوں کی شرم کی بناء پر دیا ہو، اور اس پر کوئی اِکراہ نہیں تھا اور اس نے کھانا دیتے وقت زید کو یہ بھی نہیں کہا کہ میں

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

(۲) مشکوۃ المصابیح، باب الغصب والعاریۃ ص:۲۵۵ (طبع قدیمی کتب خانہ).

اس کی قیمت لوں گا، اس لئے اس کی طرف سے یہ ہبہ ہوگیا۔[۱] اور اَب اس کے لئے اس کی قیمت کا مطالبہ کرنا دُرست نہیں، بالخصوص زید سے لئے ہوئے قرضے کو اس بناء پر روک لینا اس کے لئے جائز نہیں، بکر کو چاہئے کہ زید کی قرضے کی رقم واپس کردے اور زید پر دیانۃً لازم ہے کہ وہ کھانے کی قیمت بکر کو اَدا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۳۸ ج)

ایک بیوی کے نام سے خریدے گئے مکان میں واہب کی موت کے بعد دُوسری بیوی کے ورثاء کا دعویٰ میراث کرنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے میں، زید نے اپنے انتقال کے وقت چھ لڑکے اور ایک لڑکی اور ایک زوجہ چھوڑی۔ زید نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دُوسرا نکاح کیا تھا، پہلی بیوی سے دو لڑکے چھوڑے ہیں اور دُوسری بیوی سے چار لڑکے ایک لڑکی اور زوجہ چھوڑی۔ زید نے ایک زمین خریدی اپنی دُوسری بیوی کے نام سے جس کی رجسٹری بھی قانونی طریقے پر دُوسری بیوی کے نام سے کرائی، سرمایہ بھی قانونی طریقے پر اپنے کاروبار سے نکالا، اس پر مکان بھی تعمیر کروایا دُوسری بیوی کی اولاد کی زیرِ نگرانی مکان تعمیر ہونے کے بعد کتبہ بھی دُوسری بیوی کے نام کا لگوایا یعنی دُوسری بیوی کے نام پر اس مکان کا نام رکھا۔ سرمایہ، زمین اور مکان کی تعمیر یہ سب زید نے دیا، زید کے انتقال کے نو ماہ بعد دُوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا، اب زید کی دُوسری بیوی کے لڑکے اور لڑکی کہتے ہیں کہ یہ مکان ہماری والدہ کا ہے اس لئے اس کے وارث ہم ہیں، کیونکہ یہ مکان زید نے اپنی زندگی میں ہماری والدہ کے نام سے تیار کرا کے قانونی طریقے سے ہبہ کردیا تھا، اب پہلی بیوی کے دونوں لڑکے بھی اس میں وراثت کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ فرمائیں کہ شرعی اعتبار سے پہلی بیوی کے دونوں لڑکوں کو اس مکان میں ورثہ ملنا چاہئے یا نہیں؟

تنقیح

کیا زید مرحوم نے کبھی زبانی اس بات کا اظہار کیا تھا کہ انہوں نے یہ مکان اپنی دُوسری بیوی کی ملکیت کرکے خریدا ہے یا ان کو ہبہ کردیا ہے؟ نیز کیا کبھی ایسا ہوا کہ زید مرحوم نے اس مکان کا قبضہ

---

(۱) وفی بدائع الصنائع، کتاب الهبة ج:۲ ص:۱۲۴ والاذن نوعان صریح ودلالة ..... وأمّا الدّلالة فهی أن یقبض الموهوب له العین فی المجلس ولا ینهاه الواهب فیجوز قبضه استحسانًا .... الخ.

وفی الشامیة، کتابُ الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ قد أفاد أنّ التّلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدّالة علی التّملیک کمن دفع لفقیر شیئًا وقبضهُ ولم یتلفّظ واحد منهما بشیءٍ .... الخ.

اپنی دُوسری بیوی کو بلاشرکتِ غیر دے دیا ہو اور خود کسی اور مکان میں مقیم رہتے ہوں؟ ان سوالات کا جواب اسی کاغذ کی پشت پر لکھ کر دے دیں تو اِن شاء اللہ اصل مسئلے کا جواب دے دیا جائے گا۔

جوابِ تنقیح

زمین جب خریدی گئی اسی ارادے سے خریدی گئی کہ اس کی ملکیت موجودہ بیوی کی رہے گی، علاوہ اس کے زبانی بھی انتقال سے کچھ روز قبل انہوں نے موجودہ بیوی سے کہا کسی طرح کی بیوی کی بات پر کہ تیرے لئے تو میں اپنی ملکیت کا مکان چھوڑ کر جارہا ہوں۔ نیز مرحوم کی زندگی میں پیشگی ٹیکس فکس نہیں ہو رہا تھا، زید کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ طے ہوا تب جملہ ٹیکس موجودہ بیوی کی اولاد دیتی رہی، کبھی ایسا ہوا نہیں کہ وہ خود کسی اور مکان میں رہے ہوں، بیوی موجودہ حال میں چونکہ ایک جھگڑے کی بات پر ہوتا دیگر کوئی دُوسرا خیال بھی اس شہر میں زید کا تھا بھی نہیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ زید اور اس کی بیوی دونوں کا انتقال ہوچکا ہے، معاملے کی صحیح نوعیت خود اَصحابِ معاملہ سے تو معلوم نہیں ہوسکتی، البتہ ظاہر حال کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مکان بیوی ہی کی ملکیت ہے، بیوی کے نام رجسٹری اور بیوی اور اس کی اولاد کا اس مکان پر قبضہ بیوی کے نام کا کتبہ اور مرحوم کی زبانی گفتگو سب ظاہری طور پر اس بات کے قرائن ہیں کہ مرحوم نے یہ مکان اپنی زندگی ہی میں بیوی کی ملکیت کردیا تھا،(۱) اس صورت میں اگر پہلی بیوی کی اولاد قابلِ اعتماد گواہوں کے ذریعے یہ ثابت کردے کہ اس مکان کو بیوی کے نام رجسٹری کرانا محض ایک بینامی کارروائی تھی اور حقیقت میں زید مرحوم نے یہ مکان بیوی کی ملکیت نہیں کیا تھا، تب تو یہ مکان ان کے ترکے میں شامل ہوکر ان کے تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا، لیکن اگر پہلی بیوی کی اولاد قابلِ اعتماد گواہوں کے ذریعے یہ ثابت نہ کرسکے تو اس مکان کو زید مرحوم کی دُوسری بیوی کی ملکیت سمجھا جائے گا،(۲) اور اس میں پہلی بیوی کی اولاد کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

واللہ اعلم

۲/۷/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۸۵۹/۳۱ ج)

بیوی بچوں کی نافرمانی کی بناء پر اپنی ساری رقم صدقہ کرنے یا تبلیغ میں خرچ کرنے کا حکم

سوال:- میری بیوی اور بچوں کے درمیان کشیدگی روز بروز بڑھتی جارہی ہے، جس کی وجہ یہ

(۱ و ۲) وفی الشامیة، کتاب الھبة ج:۵ ص:۶۸۸ قلت فقد افاد أن التّلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدّالة علی التملیک کمن دفع لفقیر شیئًا وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشیءٍ ....الخ.

نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ کتاب الھبة ج:۳ ص:۴۶۶۔

ہے کہ میں اپنے بڑے لڑکے کو غلط لڑکوں کی صحبت سے روکتا ہوں، نماز پڑھنے پر زور دیتا ہوں، لوگوں نے کہا کہ یہ بالغ ہے اپنی نماز روزے کا خود ذمہ دار ہے، لہٰذا اس سے کہنا اور بولنا چھوڑ دیا۔ میں نے بیوی کو کہا کہ وہ ٹی وی لانے کو کہتا ہے، منع کردو، میں اس کے خلاف ہوں۔ لیکن بیوی نے کوئی اثر نہیں لیا، اور وہ ٹی وی لے آیا، اس قدر زور سے بجاتا ہے کہ پریشان ہوجاتا ہوں۔ ماں لڑکے کی حمایت کرتی ہے، تھوڑی دیر گھر میں رہنا بھی محال ہوگیا ہے، صاحبزادے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہتے ہیں، ہر اتوار زور زور سے بجاکر بہت پریشان کیا جاتا ہے، ان حالات میں میرا تبلیغی جماعت میں نکل جانے کا ارادہ ہے، لڑکا روزانہ پچاس ساٹھ روپے کماتا ہے، مکان پر دعویٰ کرتا ہے کہ مکان میرا ہے، گھر سے چلے جاؤ۔ دس بارہ ہزار روپیہ میرے پاس ہے، جس میں سے مسجد میں نصف صدقۂ جاریہ کے طور پر لگانا چاہتا ہوں، اور نصف اپنی ضرورت کے لئے رکھنا چاہتا ہوں، میرے لئے شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کو اپنی زندگی میں اپنے روپے کے بارے میں اختیار ہے کہ اُسے جس جائز کام میں چاہیں صَرف کریں۔[1] البتہ آپ کی بیوی کا نفقہ آپ پر ہر حال میں واجب ہے،[2] لہٰذا اپنا، اپنی بیوی کا (اور اگر کوئی نابالغ اولاد ہو تو اس کا بھی)[3] نفقہ نکال کر باقی تمام مال میں آپ تصرف کرسکتے ہیں،[4] اُسے صدقۂ جاریہ میں بھی لگاسکتے ہیں اور تبلیغ کے کام میں بھی صَرف کرسکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۳/۲۸ ب)

ساری جائیداد بیٹی کو قبضے کے ساتھ ہبہ کردی تو ہبہ دُرست ہوگیا

سوال:- میرے منجھلے تائے مرحوم منشی حسام الدین صاحب جو میرے خسر بھی تھے، اولاد میں صرف ایک اکلوتی لڑکی (میری بیوی حسن بانو عرف حسنہ) تھی، میرے والد صاحب مرحوم منشی جمیل

(۱ و ۴) وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۱۳۲ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء لأنّ کون الشیء ملکًا لرجل یقتضی أن یکون مطلقًا فی التّصرف فیه کیفما شاء.

(۲) وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز ج:۱ ص:۶۵۴ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع حنفیه کوئٹه) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء ....الخ.

وفی الدّر المختار، کتاب الطّلاق، باب النفقة ج:۳ ص:۵۷۲ (طبع سعید) ونفقة الغیر تجب علی الغیر بأسباب ثلاثة زوجیة وقرابة وملک فتجب للزوجة بنکاحٍ صحیح علیٰ زوجها.

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۶۱۲ (طبع سعید) وتجب النفقة بأنواعها علی الحر (لطفله) یعمّ الأنثیٰ والجمع الفقیر. وفی الشامیة تحته (قوله بأنواعها) من الطّعام والکسوة والسکنیٰ ....الخ.

وفی البحر الرّائق باب النفقة ج:۴ ص:۲۰۱ (طبع سعید) قوله ولطفله الفقیر أی تجب النفقة والسکنیٰ والکسوة لولده الصغیر الفقیر ....الخ.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۵۶۰ (طبع رشیدیه) نفقة الأولاد الصّغار علی الأب لا یشارکهُ فیها أحد کذا فی الجوهرة النیرة ....الخ.

الدین صاحب، اولاد میں بڑی بہن جن کا انتقال والد صاحب کی ہی زندگی میں ہوگیا تھا، ہم چار بھائی فریدالدین صاحب، بلیغ الدین و وحیدالدین صاحبان پاکستان ۱۹۴۷ء میں آگئے تھے، چوتھے محمد احمد صاحب مرحوم جو انڈیا ہی میں رہے، اوّل الذکر تین بھائیوں نے متروکہ جائیداد کے عوض جو ہند میں چھوڑ آئے تھے کلیم کر کے زمین حاصل کرلی، جبکہ محمد احمد صاحب انڈیا ہی میں رہ کر وفات پاگئے۔

والد صاحب قبلہ کے انتقال کو ۳۶ سال گزر گئے، میرے خسر منشی حسام الدین صاحب کے انتقال کو تقریباً ۴۶ سال گزرے، گویا والد صاحب کی زندگی ہی میں میرے خسر کا انتقال ہوگیا تھا۔

ہند میں مشترکہ جائیداد کا انتظام بڑے تایا منشی محمد مہدی صاحب کیا کرتے تھے، جائیداد مشترکہ مقروض ہوگئی، اور حالانکہ میرے خسر کی اولاد میں صرف لڑکی تھی، ان پر بھی برابر کا قرضہ پڑا، حالانکہ لڑکی اکثر اپنے والد مرحوم کے ساتھ ان کی ملازمت پر رہی تھی، ضرورت محسوس ہوئی کہ بعد ادائیگیٔ قرضہ جو زمین صحرائی اور سکنیٰ جائیداد رہ گئی تھی وہ حصہ برابر میں تقسیم کردی جائے، جس کی تکمیل بڑے تائے کی ہی زندگی میں ہوکر ہر ایک کے نام داخل خارج ہوگیا تھا۔

میرے خسر کو والد صاحب مرحوم اور دُوسرے اعزّہ نے مشورہ دیا کہ کل جائیداد زرعی و سکنیٰ اپنی لڑکی کے نام ہبہ کردیں، چنانچہ تمام جائیداد ہبہ کردی۔ خود والد صاحب نے ہبہ نامہ کی تکمیل کرائی اور بطورِ گواہ دستخط کئے، اور دستخط رجسٹرار کے سامنے خود میرے خسر نے باہوش وحواس کیا۔ ہبہ نامہ مکمل ہوگیا، سب جائیداد متعلقہ جو بلاشرکتِ غیرے میرے خسر کے نام چلی آرہی تھی، میری مرحومہ حسن بانو کے قبضے اور ملکیت میں چلی گئی، میرے خسر کے انتقال کے بعد دس سال میرے والد زندہ رہے لیکن کبھی انہوں نے اپنا شرعی حق میری بیوی سے طلب نہیں کیا، اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد اب میرے حقیقی بھائی وحیدالدین کو وسوسہ پیدا ہوا ہے کہ مسماۃ حسن بانو کی پاکستان میں حاصل کردہ جائیداد پر شرعی حق جتا کر اپنا حصہ طلب کروں۔ میرے حقیقی بھائی اور اُن کی اولاد، مرحومہ حسن بانو کے حقیقت میں شرعی وارث ہیں یا نہیں اور یہ حق دار ہیں یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کے خسر منشی حسام الدین صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنی ساری جائیداد اپنی بیٹی حسن بانو کو ہبہ کردی تھی، اور حسن بانو نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو اب یہ ساری جائیداد حسن بانو کی ملکیت ہوگئی،[1] یہ آپ کے خسر کے ترکے میں شامل ہوکر اُن کے دُوسرے ورثاء کو نہیں مل سکتی، اور نہ اس میں کسی اور کا حصہ ہوسکتا ہے۔ البتہ یہ حکم اس صورت کا ہے جبکہ مذکورہ ہبہ منشی حسام الدین صاحب نے اپنے مرضِ وفات سے پہلے ہی تکمیل کردیا ہو،[2] اور اگر مرضِ وفات میں

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳ وص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲۔

ہبہ کیا ہو تو اس کا حکم دوبارہ لکھ کر معلوم کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۲/ ۲۸ الف)

صرف کاغذات میں نام کرانے سے شرعاً ملکیت نہیں آئی

سوال:- میں بمعہ والد، والدہ اور تینوں بہنوں کے ہندوستان سے پاکستان پہنچے تھے، یہاں آکر میں (نورالحسن) اور میرے چھوٹے بھائی محمد سلیم دونوں نے دفتر میں نوکری کرنی شروع کردی، والد صاحب ضعیف العمر تھے، دونوں بڑی بہن حسن آرا بیگم، فردوس جہاں اپنے اپنے گھر رہنے لگیں، کیونکہ ہندوستان میں شادی ہوگئی تھی، تیسری بہن چھوٹی تھی وہ ساتھ رہتی تھی، پیسے جوڑ کر ناظم آباد میں ایک پلاٹ لیا، تھوڑا سا بنوا کر گورنمنٹ ہاؤس بلڈنگ فائنانس سے قرضہ لیا اور جوں جوں روپیہ ملتا گیا مکمل کرتا گیا۔

عرض یہ ہے کہ یہ پلاٹ ہم دونوں بھائیوں نے والدہ (بسم اللہ بیگم) کے نام سے لیا تھا، محض اس لئے کہ ہندوستان سے رنجیدہ حالات میں آئی ہیں، اس کا کچھ حصہ کرایہ پر بھی دیا ہوا تھا، کرایہ گھر میں خرچ ہوگیا تھا، اب والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، اس سے قبل چھوٹی بہن کی بھی شادی ہوگئی تھی، والدہ اور ہم دونوں بھائی اور کرایہ دار اس مکان میں رہتے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مکان میں بہنوں کا بھی حق ہے یا نہیں؟ جبکہ صرف والدہ کے نام تھا محض ان کی بزرگی کی وجہ سے، اس کا علم بہنوں کو بھی ہے۔

جواب:- اگر یہ دُرست ہے کہ یہ مکان آپ نے اپنی والدہ کو باقاعدہ ہبہ نہیں کیا تھا بلکہ محض کاغذات میں ان کے نام کر رکھا تھا، مالک آپ دونوں ہی تھے، تو یہ مکان آپ دونوں کی ملکیت ہے، اور یہ والدہ کے ترکے میں شمار نہ ہوگا، لہٰذا بہنوں کا اس مکان میں کوئی حق نہیں ہے۔ [1]

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

---

(۱) فی الدر المختار ج:۵ ص:۶۹۰ (طبع سعید کراچی) وتتم الهبة بالقبض الكامل.

وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۹۲ اتخذ لولده أو لتلميذه ثيابًا ثم أراد دفعها لغيره ليس له ذلك ما لم يبين وقت الاتخاذ انها عارية.

وفی الشامية قوله: لولده، أى الصغير وأمّا الكبير فلا بد من التسليم. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

زندگی میں تقسیمِ جائیداد کا حکم اور طریقۂ کار

سوال ۱:- ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، پہلی کو طلاق دے کر اُس کی اولاد کو اگر جائیداد میں سے کچھ نہ دے تو جواب دہ ہوگا یا نہیں؟

سوال ۲:- اگر اُس کے پاس ورثے میں جائیداد آئی ہے اُس میں سے اس کو حصہ نہ دے تو گناہگار ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- زندگی میں کوئی شخص اپنی اولاد کو کچھ دینا چاہتا ہے تو ساری اولاد کو برابر دینا چاہئے[۱]، خواہ وہ اولاد موجودہ بیوی سے ہو یا مطلقہ بیوی سے، بعض کو دینا اور بعض کو نہ دینا دُرست نہیں۔[۲]

جواب ۲:- اگر اُس شخص کو کسی اور شخص کی میراث سے کچھ حصہ ملا ہے تو اپنی زندگی میں اس میں سے کوئی حصہ کسی اور کو دینا واجب نہیں، وہ سارا حصہ خود رکھ سکتا ہے، لیکن اگر اولاد کو اس میں سے کچھ دینے کا ارادہ ہو تو برابر دے۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱ ۲۷/۲۷)

مرض الموت میں ہبہ "وصیت" کے حکم میں ہوتا ہے

سوال:- ایک شخص مرض الموت کے بستر پر پڑا ہوا ہے، جس کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے، اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہے، اور کچھ بھتیجے ہیں، اس کے بعض بھتیجے جاکر وکیل کو اس کے گھر پر بلا لیتے ہیں اور اس شخص کے بھائی اور بہن کو معلوم ہوئے بغیر اسے بہلا کر اس کا ترکہ اپنے نام ہبہ لکھواتے ہیں، اور اس کے دستخط کراتے ہیں، اور اس سے پہلے اس کے مال پر اس کی موت سے پہلے بھتیجوں کا کسی قسم کا قبضہ نہ ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ ہبہ صحیح ہوگیا جبکہ اس ہبۂ مرحوم پر بھائی اور بہن ناراض ہیں۔

(۱ تا ۳) فی الهندية ج:۴ ص:۳۹۱ الباب السادس فی الهبة للصغير ولو وهب رجل شيئاً لأولاده فی الصحة وأراد تفضيل البعض على البعض ..... روی عن أبی حنيفة رحمه الله تعالىٰ أنه لا بأس به اذا كان التفضيل لزيادة فضل له فی الدّين وان كانا سواء يكره، وروى المعلی عن أبی يوسف رحمه الله تعالىٰ انه لا بأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى الابن وعليه الفتوىٰ.

فی البحر ج:۷ ص:۹۰ (طبع بيروت وفی طبع سعيد ج:۷ ص:۲۸۸) المختار التسوية بين الذكر والانثى فی الهبة. نیز دیکھئے ص:۴۴۷ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۴۔

جواب :- چونکہ اس شخص نے بھتیجوں کو قبضہ نہیں دیا، اس لئے یہ ہبہ باطل ہوگیا، اور اگرچہ مرضِ موت میں ہبہ بحکم وصیت ہوتا ہے[۱] لیکن اسی وقت جبکہ موہوب لہ کو قبضہ دے دیا گیا ہو،[۲] قبضے کے بعد ثلث مال سے وہ ہبہ نافذ ہوتا ہے،[۳] لیکن جب قبضہ ہی نہ دیا تو پھر ہبہ باطل ہوگیا، اور کل جائیداد اس کا ترکہ سمجھی جائے گی۔ لما فی الهندية: قال فی الأصل: ولا تجوز هبة المريض ولا صدقته الّا مقبوضة فاذا قبضت جازت من الثلث واذا مات الواهب قبل التسليم بطلت. (عالمگيرية، كتاب الهبة، باب ۱۰ فی هبة المريض ج:۴ ص:۴۰۰)۔[۴]

واللہ اعلم
۱۳۹۱/۳/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۴۲/۲۲ الف)

والد کا کئی بیٹوں کو مکان ہبہ کرنا دُرست نہیں

سوال :- عبدالجبار نے ایک مکان تعمیر کرایا، اور اپنی دو لڑکیوں اور چار لڑکوں کے ساتھ اس میں آباد ہوگیا، عبدالجبار نے حالتِ صحت میں اس مکان کو اپنے چاروں بیٹوں کو زبانی ہبہ کردیا اور چاروں سے کہا کہ تم اس کے برابر کے مالک ہو اور اس مکان پر تمہارا قبضہ ہے، عبدالجبار نے کہا کہ میرا اس مکان کی ملکیت سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ میں اس مکان میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ اس ہبہ کے گواہ موجود ہیں۔

انتقال کے وقت عبدالجبار اپنی اولاد کے ساتھ اس مکان میں رہائش اختیار کئے ہوئے تھا، کیا

(۱، ۲ و ۳) وفی ردّ المحتار، باب الرّجوع فی الهبة ج:۵ ص:۷۰۰ (طبع سعيد) وهب فی مرضه ولم يسلم حتّى مات بطلت الهبة لأنّهٗ وان كان وصية حتّى اعتبر فيه الثلث فهو هبة حقيقة فيحتاج الى القبض ....الخ.

وفی تكملة حاشيه ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۰۲ لأنّ الوصية تمليک بعد الموت ..... كذا الهبة فی مرضه لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية.

وفی المحيط البُرهانی، كتاب الدعوىٰ، الفصل الرابع والعشرون فی دعوى الوصية....الخ ج:۱۶ ص:۳۴۴ (طبع ادارة القرآن كراچی) ..... ان كانت الهبة فی حالة المرض فالجواب فيها كالجواب فی الوصية لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية ....الخ

وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة: ۸۷۹ كتاب الهبة الفصل الثانی (طبع حنفيه كوئٹه) اذا وهب واحد فی مرض موته شيئًا لأحد ورثته وبعد وفاته لم يجز سائر الورثة لا تصحّ تلک الهبة أصلًا لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية .....الخ. وفی شرح المجلّة للأتاسیّ كتاب الهبة الفصل الثانی فی هبة المريض رقم المادّة: ۸۷۹ ج:۳ ص:۴۰۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه) لأن هبته (أی المريض) وان كان هبة حقيقة لٰكن لها حكم الوصية.

وكذا فی الهندية ج:۴ ص:۴۰۰ كتاب الهبة، الباب العاشر فی هبة المريض (طبع رشيديه) والبزازية علىٰ هامش الهندية، كتاب الهبة، نوع فی هبة المريض ج:۶ ص:۲۳۹ (طبع رشيديه).

(۴) طبع رشيديه كوئٹه.

ایسی صورت میں جبکہ وہ یعنی عبدالجبار مکان کے قبضے سے دستبردار ہو چکا تھا اور گواہوں کی موجودگی میں ہبہ کر چکا تھا، یہ مکان عبدالجبار کے ترکے میں شامل ہوگا؟ کیا عبدالجبار پر لازم تھا کہ وہ قبضہ دینے کے لئے وہ مکان خالی کر دیتا؟ قبضے سے مراد آباد ہونا ہے یا مالکانہ حقوق؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عبدالجبار نے اپنے بیٹوں کو مکان کا جو ہبہ کیا وہ شرعاً دُرست نہیں ہوا، اور اب عبدالجبار کے تمام ورثاء اس مکان میں حق دار ہیں کیونکہ یہ ہبۃ المشاع ہے اور جب تک مکان کے الگ الگ حصے کر کے باقاعدہ تقسیم شدہ شکل میں ہبہ نہ کیا جائے ہبہ دُرست نہیں ہوتا، لما فی الکنز وسائر المتون: ولو وھب اثنان دار الواحد صح ..... لا عکسه وھو أن یھب واحد من اثنین کبیرین ولم یبین نصیب کل واحد عند أبی حنیفة لأنه ھبة النصف من کل واحد منھما .....الخ. (البحر الرائق ج:۷ ص:۳۱۵)[1]. وقال فی الدر المختار: ولو سلمه شائعًا لا یملکه فلا ینفذ تصرفه فیه وقال الشامیؒ تحته: وکما یکون للواھب الرجوع فیھا یکون لوارثه بعد موته لکونھا مستحقة الرد .... ومضمون بالھلاک .... فحیث علمت أنه ظاھر الروایة، وأنه نص علیه محمد ورووہ عن أبی حنیفة ظھر أنه الذی علیه العمل وان صرّح بأن المفتی به خلافه ولا سیما انه یکون ملکا خبیثًا" (شامی ج:۴ ص:۵۱۱)[2]۔

لیکن ہبہ دُرست نہ ہونے کی یہ وجہ اس وقت ہے جبکہ عبدالجبار نے مکان کے باقاعدہ حصے بنا کر اور تقسیم کر کے ہبہ نہ کیا ہو، اگر باقاعدہ حصے بنا کر تقسیم کر دیئے تھے تو اس صورت میں مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں، لیکن یہ تصریح کریں کہ عبدالجبار کونسے بیٹے کے حصے میں رہتا تھا؟ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۲/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۵۱/۲۸ ج)

خدمت گار بیٹے کو چند اشیاء ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- میں نے والدہ کی بہت زیادہ خدمت کی، والدہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے، انہوں نے انتقال سے کافی پہلے اپنی تندرستی کے زمانے میں ایک ڈولی، ایک بڑی پیٹی، ایک چھوٹی پیٹی اور کچھ زیور مجھے دے کر کہا: ''سب کو دے چکی ہوں، تم نے میری بہت خدمت کی ہے، یہ چیزیں میں تمہیں دیتی ہوں'' کیا یہ سامان تمام بھائیوں میں تقسیم ہوگا یا یہ صرف میری ذاتی ملکیت ہے؟

(فیاض اعوان)

---

(۱) البحر الرّائق ج:۷ ص:۲۸۹ کتاب الھبة (طبع سعید).
(۲) الدر المختار ج:۵ ص:۶۹۲ کتاب الھبة (٪ ٪).

جواب :- آپ کی والدہ صاحبہ نے اپنی صحت کی حالت میں (یعنی مرضِ وفات سے پہلے پہلے)[1] جو کچھ آپ کو دے دیا اور آپ نے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے،[2] وہ آپ کی ملکیت ہے، اس میں ان کے دُوسرے ورثاء کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۸/۱۲/۲۷ھ

***

(۱و۲) دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲و۳۔

﴿کتاب الودیعة والعاریة﴾
(امانت اور عاریت کے مسائل کا بیان)

عاریت پر دیئے ہوئے زیورات کی بعینہٖ واپسی یا پوری قیمت کا مطالبہ کرنا جائز ہے

سوال:- آج سے بیس پچیس سال پہلے اپنی بڑی بہن کو مالی مشکلات میں مبتلا دیکھ کر بطور ہمدردی کے سترہ تولے کے زیورات اُن کو اس شرط پر دیئے تھے کہ فی الحال ان کو بینک میں رہن رکھ کر اپنی مشکلات دُور کریں، اور جب اُن کے پاس روپیہ ہو تو زیور چُھڑا کر مجھے واپس کردیں۔ اس کا وعدہ بھی مجھ سے اُنہوں نے کیا تھا کہ ایسا ہی کیا جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، جائیداد کا سولہ سترہ ہزار روپے بھی انہیں ملا جو مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا، مگر کسی نہ کسی طرح مجھے اس کا علم ہوگیا، میں نے زیور کا مطالبہ کیا تو معلوم ہوا کہ روپے اُن کے لڑکے نے وصول کئے ہیں، اور اُس سے اُنہوں نے زیور کے چُھڑانے کے لئے کہا بھی کیونکہ زیور اُسی کے نام سے رکھا گیا تھا اور روپیہ بھی اُس کے پاس ہی تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، اور زیور نیلام ہوگیا اور نہ چھڑا کر دیا اور نہ اُس وقت اُس کی قیمت ادا کی، اب کہتا ہے کہ جس زمانے میں زیور نیلام ہوا ہے اُس وقت کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں، میں نے کہا میں نے تو صرف رہن کی اجازت دی تھی، نیلام کروانے کو تو نہیں کہا تھا، اُس کو نیلام نہ ہونے دینے کی ذمہ داری مجھ پر نہ تھی، میں نے سونا دیا تھا اُتنا سونا لوں گی، یہ مطالبہ میرا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی بہن پر واجب ہے کہ جیسا زیور آپ نے ان کو دیا تھا یا تو ویسا ہی بنوا کر آپ کو واپس کریں، یا اُس کی جو قیمت واپسی کے دن ہو وہ قیمت ادا کریں، اور آپ کا مطالبہ شرعاً جائز ہے، لما فی الدر المختار: فان آجر المستعیر أو رهن فهلكت ضمنه المعیر.(1) (شامی ج:۴ ص:۵۰۳)۔ وفیه: إلّا اذا استعارها لیرهنها فتكون كالإجارة وقال الشامی تحته:

---

(۱) الدّر المختار کتابُ العاریة ج:۵ ص:۶۷۹ (طبع سعید).

وفی درر الحکام شرح غرر الأحکام کتاب العاریة ج:۷ ص:۱۳۴ فان آجر أو رهن المستعیر فهلکت العاریة ضمّنه المعیر أی ضمن المعیر المستعیر.

وکذا فی الهندیة الباب الخامس فی تضییع العاریة وما یضمنه المستعیر وما لا یضمن ج:۴ ص:۳۶۷ (طبع رشیدیه کوئٹه).

لأن هٰذه اعارة فيها منفعة لصاحبها فانها تصير مضمونة فى يد المرتهن وللمعير أن يرجع على المستعير بقيمته. (شامی ج:۴ ص:۵۰۵)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۵۴۴/۴۴ ۲۸ ب)

گھڑی ساز کے پاس عرصہ دراز سے رکھی ہوئی گھڑیوں کا حکم

سوال:- زید گھڑی سازی کی دُکان کرتا ہے، بعض صاحب گھڑیاں مرمت کے لئے دے کر واپس لینے نہیں آتے، اور نہ اُمید ہے کہ وہ کبھی واپس آ کر لے جائیں گے، اور پڑے ہوئے تقریباً دو تین سال تک ہو چکے ہیں، باوجود حفاظت سے ہونے کے زنگ آلود ہوکر خراب ہونے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟ کیا زید ان کے بدلے میں رقم خیرات کر کے اپنی ملک بنا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مذکورہ میں زید کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ گھڑیوں کی قیمت خیرات کر کے اپنی ملک بنالے، بلکہ تمام عمر ممکن حد تک ان کی حفاظت کرنی چاہئے، تاوقتیکہ اصل مالک اُسے لے جائے یا اس کی طرف سے کوئی ہدایت موصول ہو، یا اس کی موت کا علم ہوجائے، تو اس کے ورثہ کے سپرد کردیا جائے، کیونکہ یہ گھڑیاں زید کے پاس بطورِ امانت ہیں، اور امانت کو لقطہ کی طرح صدقہ نہیں کیا جاسکتا۔

دليل الصغرىٰ فى قول الهندية وحكم الأجير المشترک أن ما هلک فى يده من غير صنعه فلا ضمان عليه فى قول أبى حنيفة. (عالمگیریة ج:۴ ص:۵۱۸)۔[2] ودليل الكبرىٰ فى قوله غاب المودِع ولا يدرى حياتهُ ولا مماتهُ يحفظها أبدًا حتى يعلم بموته وورثته كذا فى الوجيز للكردرى ولا يتصدق بها بخلاف اللقطة كذا فى الفتاوىٰ العتابية. (عالمگیریة ج:۴ ص:۳۵۲)۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۲/۲۵ھ

---

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار كتاب العارية ج:۵ ص:۶۸۲ (طبع سعيد).

(۲) الهندية ج:۴ ص:۵۰۰ باب:۲۸ (طبع مكتبه رشيديه) وفى المحيط البُرهانى كتاب الاجارة الفصل الثامن والعشرون فى بيان حكم الأجير الخاص والمشترک ج:۱۲ ص:۳۹ (طبع ادارة القرآن كراچى) ومن حكم الأجير المشترک ان ما هلک فى يده من غير صنعة فلا ضمان عليه فى قول أبى حنيفة وهو قول زفر والحسن رحمهما الله، وانه قياسٌ.... الخ.

(۳) الهندية باب:۷ ج:۴ ص:۳۵۴ (طبع مكتبه رشيديه) وفى الشامية كتاب الايداع ج:۵ ص:۶۷۲ (قبيل كتاب العارية) (طبع سعيد) غاب ربّ الوديعة ولا يدرى أهو حىّ أم ميّت يمسكها حتّى يعلم موته ولا يتصدق بها بخلاف اللّقطة.... الخ.

وفى المحيط البرهانى كتاب الوديعة الفصل العاشر فى المتفرّقات ج:۸ ص:۳۱۷.

(۱۰۳۴۱) فى فتاوى أبى اللّيث رجل استودع رجلًا ألف درهم ثم غاب ربّ الوديعة لا يدرى أحىّ هو أم ميّت فعليه أن يمسكها حتّى يعلم موته ولا يتصدق بها بخلاف اللّقطة.

﴿کتاب اللّقطة﴾

(گری پڑی ہوئی چیزوں کا بیان)

سیلاب میں ملنے والی مختلف اشیاء کا حکم

سوال:- میں شٹرنگ کا کام کرتا ہوں، یعنی چھتوں کی ڈھلائی کے وقت تختے بچھا کر اس کو دُرست کردیتا ہوں تاکہ ڈھلائی کرنے والے اُس پر ڈھلائی کرسکیں۔ تختہ میرا ذاتی ہوتا ہے، میں اُس کی اُجرت وصول کرتا ہوں، اس سیلاب میں ہمارے یہ تختے بہہ گئے، بہت سے دُوسرے لوگوں نے بھی اُٹھالئے، اور کچھ تختے کسی جگہ پر پڑے ہوئے ہیں، لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ تختے میرے ہیں یا نہیں؟ کیا ایسی حالت میں یہ تختے میں اُٹھا سکتا ہوں؟

جواب:- اگر علامات وقرائن سے گمان غالب اس بات کا ہوجائے کہ یہ تختے آپ ہی کے ہیں، تو آپ ان کو اُٹھا کر لے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ کوئی دُوسرا ان کا دعوے دار نہ ہو، اور اگر گمان غالب نہیں ہے یعنی دونوں احتمال برابر ہیں تو پھر اس پر لقطہ کا حکم جاری ہوگا۔ یعنی پہلے تو ان کے مالک کو تلاش کریں،[1] اگر مالک کے ملنے سے مایوسی ہوجائے،[2] تو اگر خود مستحق زکوٰۃ ہوں تو اپنے استعمال میں لے آئیں، ورنہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیں،[3] وغالب الظنّ عندهم ملحق باليقين وهو الذي

(۱، ۲، ۳) وفی الهندية كتاب اللّقطة ج:۲ ص:۲۸۹ وص:۲۹۰ (طبع رشيديه) اذا رفع اللقطة يعرفها ..... وفی هذا الوجه لهٗ أن يأخذها ويحفظها ويعرفها حتّى يوصلها الیٰ صاحبها.

وفيها أيضًا ج:۲ ص:۲۸۹ ويعرف الملتقط اللّقطة فی الأسواق والشوارع مدّة يغلب علیٰ ظنّه ان صاحبها لا يطلبها بعد ذلک هو الصحيح ..... ثم بعد تعريف المدّة المذكورة الملتقط مخيّر بين أن يحفظها حسبة وبين أن يتصدق بها .....الخ.

وفی الدّر المختار كتاب اللقطة ج:۴ ص:۲۷۸ (طبع سعيد) وعرّف أی نادی عليها حيث وجدها وفی المجامع الی أن علم أن صاحبها لا يطلبها.

وفی الشامية تحته (قوله الیٰ ان علم ان صاحبها لا يطلبها) لم يجعل للتّعريف مدّة اتباعًا للسرخسی فانه بنی الحكم علی غالب الرّأی فيعرّف القليل والكثير الیٰ أن يغلب علی رأيه ان صاحبهٗ لا يطلبه وصحّحه فی الهداية وفی المضمرات والجوهرة وعليه الفتویٰ .....الخ.

وفی الفتاویٰ التاتارخانية كتاب اللقطة ج:۵ ص:۵۸۵ (طبع ادارة القرآن) .....وفی هذا الوجه لهٗ أن يأخذها ويحفظها ويعرّفها حتّی يوصلها الی صاحبها.

وفی بدائع الصنائع، كتاب اللّقطة، فصل فی بيان ما يصنع باللّقطة ج:۸ ص:۳۳۳ ثم اذا عرّفها ولم يحضر صاحبها مدّة التّعريف فهو بالخيار ان شاء أمسكها الیٰ أن يحضر صاحبها وان شاء تصدّق بها علی الفقراء.

وفی الشامية، كتاب اللّقطة ج:۴ ص:۲۷۹ (طبع سعيد) أی فينتفع الرّافع بها لو فقيرًا والّا تصدق أی من رفعها من الأرض.

وفی بدائع الصنائع، كتاب اللّقطة، فصل فی بيان ما يصنع باللّقطة ج:۸ ص:۳۳۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وان كان فقيرًا فان شاء تصدق بها علی الفقراء وان شاء أنفقها علیٰ نفسه.

وفی البحر الرّائق، كتاب اللقطة ج:۵ ص:۱۵۷ (طبع سعيد) قوله وينتفع بها لو فقيرًا والّا تصدق علی أجنبی ولأبويه وزوجته وولده لو فقيرًا أی ينتفع الملتقط.

وكذا فی الهداية كتاب اللّقطة ج:۲ ص:۶۱۸ (طبع شركت علميه ملتان)

یبتنی علیه الأحکام، یعرف ذٰلک من تصفیح کلامهم فی الأبواب، صرحوا فی نواقض الوضوء بأن الغالب کالمتحقق. (الاشباه والنظائر ج:۱ ص:۹۴، قاعده:۳)[۱]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۹/۸/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۸۷/ ۲۸ ج)

مسافر سامان رکھ کر چلا گیا ہو تو اُس کے سامان کا حکم

سوال:- ایک آدمی ہمارے ساتھ سفر میں تھا، راستے میں وہ کہیں اُتر گیا اور اُس کا سامان ہمارے پاس رہ گیا، اور اس شخص کو ہم جانتے بھی نہیں ہیں، تقریباً سات سال ہونے والے ہیں، اب اس سامان کو کیا کیا جائے؟

جواب:- اگر وہ شخص زندہ ہو اور اس کا پتہ معلوم ہو تو اس کو سامان پہنچائے،[۲] اور اگر وہ زندہ نہ ہو تو اس کے ورثاء کو پہنچادے،[۳] اگر اس کا پتہ معلوم نہ ہو تو اُسے اس وقت تک تلاش کیجئے جب تک یہ خیال ہو کہ وہ شخص سامان کی تلاش میں ہوگا، اور جب ملنے سے مایوسی ہو جائے تو اُسے صدقہ کر دیجئے۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
۲/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۰۴/ ۲۸ ج)

---

(۱) الاشباه والنظائر ج:۱ ص:۳۷ فائدة:۲ قاعدة:۳ (طبع سعید).

(۲و۴) حوالہ جات اور تفصیلی عبارات کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) کیونکہ زندہ نہ ہونے اور اُس کے ورثاء کا بھی پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں ایک مخصوص مقدار کی حد تک یہ مال لقطہ شمار ہوگا۔

وفی الدّر المختار، کتاب اللّقطة ج:۴ ص:۲۸۴ (طبع سعید) وفی الحاوی: غریب مات فی بیت انسان ولم یعرف وارثهٗ فترکتهٗ کلقطة ما لم یکن کثیرًا فلبیت المال بعد الفحص عن ورثته سنین فان لم یجدهم فله لو مصرفًا.

وفی المحیط البُرهانی، کتاب اللّقطة، الفصل الثانی فی تعریف اللّقطة وما یصنع بها بعد التعریف ج:۸ ص:۱۷۳ (طبع ادارة القرآن کراتشی) ۹۸۷۹ فی ودیعة أهل سمرقند غریب مات فی دار رجل ولیس له وارث معروف وخلف من المال ما یساوی خسمة دراهم وصاحب الدّار فقیر فأراد أن ینفقها علیٰ نفسه فله ذٰلک لأنّه فی معنی اللّقطة.

وفی البحر الرّائق، کتاب اللّقطة ج:۵ ص:۱۵۸ قبیل کتاب الاباق (طبع سعید) وفی الولوالجیة هی لو مات غریبٌ فی دار رجل ومعه قدر خسمة دراهم فأراد صاحب البیت أن یتصدّق علیٰ نفسه ان کان فقیرًا فله ذٰلک کاللّقطة ولم یصرّحا بما زاد علی الخمسة وفی الحاوی القدسی واذا مات الغریب فی بیت انسان ولیس لهٗ وارث معروف کان حکم ترکته کحکم اللّقطة اِلّا اذا کان مالًا کثیرًا یکون لبیت المال بعد البحث والفحص عن ورثته سنین. وفی الخانیة رجل غریب مات فی دار رجل ولیس لهٗ وارث معروف وخلف ما یساوی خسمة دراهم وصاحب الدّار فقیر لیس لهٗ أن یتصدّق بهٰذا المال علیٰ نفسه لأنّه لیس بمنزلة اللّقطة وهو مخالف لما ذکرنا والأوّل أثبت وصرّح به فی المحیط.

وفی مجمع الأنهر فی شرح ملتقی الأبحر الانتفاع باللّقطة.

وفی الاختیار رجلٌ غریب مات فی دار رجل لیس لهٗ وارث معروف وخلّف مالًا وصاحب المنزل فقیرٌ فله الانتفاع به بمنزلة اللّقطة وفی الخانیة خلافهٗ.

نیز دیکھئے: امداد الأحکام، کتاب الودیعة والعاریة ج:۳ ص:۶۰۷ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

﴿کتاب الغصب والضمان﴾

(غصب اور ضمان کے مسائل کا بیان)

مسجد کی دُکان پر ناجائز قبضہ کرنے اور کرایہ ادا نہ کرنے کا حکم

سوال:- ایک تعمیر شدہ مسجد سے ملحقہ قطعہ زمین پر مسجدِ مذکور کے مجوزہ توسیعی نقشے کے مطابق ایک دِینی مدرسہ، وضوء خانہ، اور مسجد و مدرسہ کے مستقل اِخراجات کو پورا کرنے کے لئے پختہ دُکانیں تعمیر کی گئیں، تعمیر سے قبل اس قطعہ زمین واقع شمالی کنارے پر تین کیبن رکھے ہوئے تھے، جن میں سے دو کیبن والے پابندی سے مسجد کو کرایہ ادا کر رہے تھے، مگر درمیان کے کیبن والا اپنے اثر و رُسوخ کی بناء پر جبراً قابض تھا، اور کرایہ نہیں دیتا تھا۔ اس کے بعد اپنی علالت کے باعث اُس نے وہ کیبن کرایہ پر دیا، اور کرایہ دار سے کرایہ وہ خود وصول کرتا رہا، اس درمیان میں وہ شخص فوت ہوا اور اس کے بعد اس کی بیوی اس پر قابض تھی، جب وہاں پر پختہ دُکانیں بنی شروع ہوئیں تو ان کو یہ نوٹس دیا گیا کہ تم اپنا کیبن اُٹھالو، جب دُکانیں پختہ تعمیر ہوگئیں تو متوفی کی بیوی نے پختہ دُکان کا مطالبہ کیا، مسجد کمیٹی کے ایک ممبر نے جو متوفی کی بیوی کا رشتہ دار ہے، اس کو دِلوانے کی کوشش کی اور اپنی ضمانت پر دُکان دینے کی درخواست کی، ہرچند کہ متوفی نے مسجد کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا، بیوہ جان کر دُکان کو ان کے قبضے بس اسی شرط پر دیا گیا کہ کرایہ سے دس روپیہ ماہوار مسجد میں داخل کرتی رہے، مگر اب وہ دُکان کا پچاس روپے کرایہ وصول کرتی ہے مگر مسجد کا وہ دس روپیہ نہیں دیتی، اب صورتِ مذکورہ میں متوفی کا قبضہ تسلیم کیا جائے گا اور کیا اَز رُوئے شریعت بیوہ کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے جائیں گے؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں تو متوفی کی بیوہ کا کوئی مالکانہ حق دُکان پر نہیں ہے، ان پر واجب ہے کہ وہ مسجد کی دُکان کا مقرّرہ کرایہ ادا کریں، اور اگر اَدا نہیں کرتیں تو مسجد کی دُکان خالی کردیں، یوں تو کسی بھی مسلمان کے حق پر ناجائز قبضہ کرنا سخت حرام ہے،[۱] اور ناجائز

---

(۱) وفی المشکوٰۃ، باب الغصب والعاریۃ ص:۲۵۵ (طبع قدیمی کتب خانہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحلّ مال امرئ مسلم الّا بطیب نفسٍ منہٗ. نیز دیکھئے ص:۴۸۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

ہے، لیکن خاص طور سے مسجد کے کسی حق کو دبا لینا اور زیادہ وبال کا موجب ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۳/۱۹ الف)

مال برآمد کرنے کی صورت میں اگر مال راستے میں ہلاک ہوجائے تو جہاز کمپنی یا انشورنس کمپنی سے ضمان لینے کا حکم

سوال:- جہاز میں جو مال آتا ہے وہ راستے میں نقصان کا شکار یا ضائع ہوجاتا ہے، اس نقصان کا بدلہ انشورنس والے اداء کرتے ہیں، شاید یہ جائز نہیں، دُوسری صورت میں یہ جہاز راں کمپنی والے اس نقصان کی رقم ادا کرتے ہیں جو نقصان کے مال کے برابر یا اس سے کچھ کم ہوتا ہے، کیا جہاز راں کمپنی سے اس نقصان کا بدلہ لینا جائز ہے؟

تنقیح

پہلے چند اُمور کی وضاحت کریں، وضاحت پر کچھ بتایا جاسکے گا۔

۱:- کیا جہاز راں کمپنی کو کرایہ کے علاوہ کچھ رقم پیشگی دینی پڑتی ہے یا نہیں؟

۲:- اگر صرف انشورنس کرادیا جائے تو کیا تب بھی جہاز راں کمپنی سے نقصان وصول کیا جاسکتا ہے؟ اگر وصول کیا جاسکتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

۳:- اگر دونوں سے علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا جائے تو کیا جب بھی کسی ایک ہی سے وصول کرنا ہوگا یا دونوں سے؟ اگر نہیں تو کیا وجہ؟

۴:- اگر انشورنس نہ کرایا جائے اور جہاز راں کمپنی کو بھی پیشگی کچھ رقم نہ دی جائے تو کیا اس کے باوجود جہاز راں کمپنی نقصان دیتی ہے؟

جوابِ تنقیح

۱:- نہیں، جہاز راں کمپنی صرف کرایہ وصول کرتی ہے، اور اس سے زیادہ مزید کچھ نہیں لیتی۔

۲:- جی ہاں، وصول کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اصل بنیادی ذمہ داری جہاز کمپنی کی ہے کہ مال معاہدے کے مطابق پورا پورا جگہ پر پہنچائے، اس کی مزید وضاحت کردُوں کہ اس کی مثال تقریباً

ایسی ہے کہ زید کے ذمہ آپ کوئی کام کرتے ہیں اور اس کا ضامن بکر بن جاتا ہے کہ اگر زید نے یہ کام پورا نہ کیا تو میں ذمہ دار ہوں، لہٰذا دراصل اصلی ذمہ داری تو زید کی ہے جو مثل جہاز کمپنی کے ہے، اور بکر مثل انشورنس کمپنی کے۔

دراصل لوگ عام طور پر اپنے نقصان ایسی صورت میں انشورنس کمپنی سے لیتے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ انشورنس پالیسی اصل لاگت سے کچھ بڑھ کر کرواتے ہیں، اس کے برعکس جہاز راں کمپنی سے وصول یابی میں دو چار ماہ لگ جاتے ہیں اور صرف نقصان وہی ملتا ہے جو مال کی اصل لاگت ہوتی ہے، اور کچھ زیادہ نہیں ملتا۔

بہرحال اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ نقصان کی رقم صرف ایک ذریعے ہی سے وصول ہوسکتی ہے، یعنی یا تو جہاز کمپنی سے یا انشورنس کمپنی سے، اس کی مزید وضاحت کردوں۔

الف:- انشورنس ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں جہاز کمپنی ذمہ دار ہے کہ نقصان کی اصل لاگت اداء کرے، کیونکہ جیسا اُوپر عرض کیا کہ اصل ذمہ داری تو جہاز کمپنی کی ہے کہ وہ مال پورے کا پورا صحیح طور پر مقام پر جس سے کرایہ وصول کیا ہے اس کو پہنچائے، جہاز راں کمپنیاں پوری دُنیا میں ہیں، اور سب کا قانون یکساں ہے، دُنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں انشورنس کا نظام نہیں ہے، اگر ہے بھی تو حکومت کی طرف سے انشورنس کرانا لازمی نہیں ہے۔

ب:- اگر انشورنس ہے تو نقصان وصول کرنے کے لئے دو راستے ہیں، (اے) جہاز کمپنی، (بی) انشورنس کمپنی۔ اور دونوں راستوں کی وضاحت یہ ہے:-

الف:- جہاز کمپنی سے اس صورت میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں، اور کئی قانونی پیچیدگیاں دُور کرنی پڑتی ہیں، اور رقم صرف اتنی ملتی ہے جتنی مال کی اصل لاگت ہے، اور بعض اوقات بعض جہاز کمپنی باہر ملکوں کی ہوتی ہیں لہٰذا ان کے پاس پیسہ باہر ملکوں سے آتا ہے جس کی وجہ سے مزید وقت لگتا ہے، بہرحال رقم وصول ہونے کے بعد جہاز راں کمپنی کو ایک رسید دینی پڑتی ہے کہ پیسہ پورے کا پورا وصول پایا، اب ہمارا کوئی مزید دعویٰ نہیں۔

ب:- انشورنس کمپنی:- اس صورت میں نقصان کی ادائیگی جلد ہوجاتی ہے، بعض اوقات اصل رقم سے کچھ زیادہ وصول ہوتا ہے، انشورنس کمپنی جب رقم ادا کرتی ہے اُس وقت آپ کو ایک خط انشورنس کمپنی کو دینا پڑتا ہے کہ فلاں فلاں جہاز سے جو ہمارا نقصان فلاں فلاں ہوا ہے اس کی رقم ہم نے ان سے وصول کرلی، انشورنس والے اگرچہ رقم ہم کو دے دیتے ہیں پھر یہ جہاز کمپنی سے وصول کرتے ہیں،

ان کو کب ملتا ہے یہ پتہ نہیں، بہرحال دیر ہو یا سویر انشورنس والوں کو جہاز کمپنی ادا ضرور کردیتی ہے، انشورنس والوں کو نقصان یہ ہوتا ہے کہ اوّل ادائیگی کرنا پڑتی ہے جبکہ ان کو دیر سے ملتا ہے، دُوسری بات یہ ہے کہ جہاز کمپنی بھی انشورنس والوں کو کم ہی ادا کرتی ہے جبکہ انشورنس والے زیادہ ادا کرتے ہیں، یہ ان لوگوں کا معمول ہے اور وہ اس کے عادی ہوتے ہیں۔

۳:- آپ کے اس سوال کا جواب شاید اُوپر آگیا ہے، بہرحال رقم کی وصولی کا معاملہ جہازراں کمپنی اور انشورنس کمپنی کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے، وصول یابی ظاہر ہے جس سے معاملہ کیا جائے گا اس سے ہی ہوگی، ہاں انشورنس کمپنی سے وصول یابی کی صورت میں انشورنس کمپنی خود جہازراں کمپنی سے مال کی قیمت وصول کرے گی، کیونکہ جیسا کہ اُوپر عرض کیا جاسکتا ہے کہ مال برداری کی اصل ذمہ داری جہازراں کمپنی پر ہے۔

۴:- جی ہاں، وہ ایسا کرنے کے پابند ہیں، اس کا تفصیلی جواب اُوپر گزر چکا ہے، بہرحال آپ نے ایک لفظ لکھا ہے کہ ''پیشگی کچھ رقم'' اس سے شاید آپ کی مراد کرایہ ہے جو جہاز کمپنی مال برداری کے لئے لیتی ہے، تو کرایہ کی صورت یہ ہے کہ عموماً تو جہاز والے کرایہ پیشگی لیتے ہیں اور ہمارے معاملے میں ایسا ہی ہے، مگر بعض صورتوں میں اگر مال فروخت کرنے والا یا خریدنے والا چاہے تو کرایہ بعد میں بھی ادا کرسکتے ہیں، مثال کے طور پر ہم نے مال جدہ شریف روانہ کیا تو ہم یہ جہاز والوں کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ کرایہ آپ کو جدہ میں خریدار ادا کرے گا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مال کا نقصان کسی ایسی آفت کی وجہ سے ہوا ہو جس سے بچنا ممکن نہ تھا، مثلاً پورے جہاز میں آگ لگ گئی یا قزاقوں نے حملہ کردیا، تب تو نقصان کی رقم وصول کرنا آپ کے لئے جہاز کمپنی سے بھی جائز نہیں، لیکن اگر اس قسم کی کوئی عمومی آفت نہیں تھی تو جہاز کمپنی سے نقصان وصول کرنے کی گنجائش ہے، وفی البدائع: لا یضمن (ای الأجیر المشترک) عنده ما هلک بغیر صنعه قبل العمل أو بعده لأنه أمانة فی یده وهو القیاس، وقالا یضمن اِلَّا من حرق غالب أو لصوص مکابرین وهو استحسان اهـ. قال فی الخیریة ..... قول أبی حنیفة قول عطاء وطاؤس وهما من کبار التابعین وقولهما قول عمر وعلیّ، وبه یفتیٰ احتشامًا لعمر وعلیّ وصیانة لأموال الناس، والله اعلم اهـ. لأنه اذا علم أنه لا یضمن ربما یدعی أنه سرق أو ضاع من یده وفی الخانیة والمحیط والتتمة الفتویٰ علیٰ قوله، فقد اختلف الافتاء وقد سمعت

ما فی الخیریة. (شامی ج:۵ ص:۴۰ و ۴۱)۔[1]

قلت: وحیث اختلف الافتاء ورجحان الشامی الیٰ قولهما ظاهر فالأولی فی عصرنا الافتاء بقولهما صیانة لأموال الناس وتحرزا عن الوقوع فی فتنة التأمین الذی هو مرکب من الربا والقمار۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۷/۲۸ ب)

واقعے کی صحیح صورتِ حال چھپانے کی وجہ سے کسی کا حق ضائع ہونے اور اس کے ضمان کا حکم

سوال:- میرے زندہ بھائی وحیدالدین نے مجھے خود تقریباً پانچ سال ہوئے ذکر کیا کہ بھائی صاحب! پٹواری اللہ بخش نے ایک بات مجھ سے کہی تھی کہ: "بلیغ الدین کے یونٹوں (جس پر کہ زمین الاٹ اور قبضہ ملتا ہے) کا یہ سرٹیفکیٹ آگیا ہے، (جو پٹواری مذکورہ کے ہاتھ میں تھا اور میرے بھائی نے خود وہ سرٹیفکیٹ دیکھا ہے) تو اس پر جو زمین مل سکتی ہے نصف آپ یعنی وحیدالدین لے لیں اور آدھی میں (پٹواری) لے لوں۔" تو میں نے (وحیدالدین نے) پٹواری سے کہا کہ: "یہ تو معاملہ میرے بھائی کا ہے، ایسا تو میں نہیں کرسکتا، مگر ایسا کرو کہ اس سرٹیفکیٹ کو لاہور واپس بھیج دو۔" اب پٹواری کو موقع مل گیا، سننے میں وثوق سے آیا ہے کہ پٹواری نے اُس سرٹیفکیٹ سے بالائی بالائی طریقے پر زرعی زمین حاصل کرکے فروخت کردی جس کی مجھ کو خبر ایک زمین دار نے دی، جو خود عینی شاہد ہے، مگر مدد کرنے سے قاصر ہے، اور یہ خبر زمین دار نے سوا سال بعد دی، اور اسی مدّت کے بعد میرے بھائی وحیدالدین نے یہ خبر مجھ کو سنائی، چونکہ محکمۂ بحالیات ختم ہوگیا تو میں لاہور بھی تحقیقات نہیں کرسکا، اس میرے حقیقی بھائی کے اخفا کرنے سے مجھ کو دس ایکڑ زمین کا نقصان ہوا، اُن کو فوراً مجھے خبر کرنا چاہئے تھا تاکہ پٹواری

---

(۱) ردّ المحتار، کتاب الاجارة، باب ضمان الأجیر ج:۶ ص:۶۵ (طبع سعید).

وفی مجمع الضّمانات ج:۱ ص:۲۶۲ ان الأجیر المشترک ضامنٌ عنده ما هلک بغیر صُنعهٖ فاذا کان الثوب فی ضمانهٖ کان الضّمان علیه ما لم یعلم أنّه تخرّق من دقّ صاحب الثوب وروی بشر عن أبی یوسفؒ انّ القصّار یضمن نصف النقصان ویعتبر فیه الأحوال وامّا علیٰ قول أبی حنیفة ینبغی أن لا یجب الضّمان فی فعل القصّار لأنّ عنده الثّوب أمانة عند القصّار ولیس بمضمون.

وفی الهندیة، کتاب الاجارة، الباب الثامن والعشرون فی بیان حکم الأجیر الخاص والمشترک ...الخ ج:۴ ص:۵۰۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) وحکم الأجیر المشترک ان ما هلک فی یده من غیر صنعهٖ فلا ضمان علیه فی قول أبی حنیفة وهو قول زفر والحسن وانّه قیاس ....الخ.

سے سرٹیفکیٹ لے لیتا، یا خود لاہور جاکر اس کی نقل نکالتا، اس پر بھائی نے کہا کہ ”میں نے غلطی کی آپ سے اس واقعے کا ذکر کیا“ اس پر میں نے جواب میں کہا کہ: ”یہ تمہاری اور حماقت ہے“ میں نے کلیم لاہور میں یونٹ بننے کے لئے کردیا تھا، کچھ تو بن کر آگئے تھے، کچھ غلطی سے رہ گئے تھے، تو بعد میں بقایا یونٹ آئے تو پٹواری کے ہاتھ لگ گئے اور اس کا تذکرہ بھائی وحیدالدین نے اُس سے کیا تھا کہ مل بانٹ کر یہ زمین حاصل کرلیں گے، اب میں نے بھائی وحیدالدین کو لکھا ہے کہ اس کی پوری ذمہ داری تم پر ہوتی ہے لہٰذا آپ اپنی ملکیت والی زمین سے اتنا واپس دیں یا قیامت میں اللہ پاک کی عدالت میں یہ معاملہ پیش ہوگا، میرے حقیقی بھائی وحیدالدین صاحب کہاں تک شرعاً ذمہ دار ہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کے بھائی وحیدالدین صاحب نے آپ کی بدخواہی کرکے گناہ کیا،[۱] جس پر انہیں توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے،[۲] اور آپ سے معافی مانگنی چاہئے، لیکن ان پر اس زمین کا کوئی تاوان واجب نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے پٹواری کو محض مشورہ دیا تھا، زمین کے ضائع کرنے میں اُن کا براہِ راست دخل نہیں۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۸ الف)

سرکاری گاڑی بغیر اِجازت دُوسرے کاموں میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:- بعض سرکاری ملازم کو گاڑی، ویگن وغیرہ سرکاری کام کے لئے ملی ہوئی ہوتی ہے، وہ ملازم بعض مواقع پر اپنے رشتہ دار اور واقف کار سواریوں کو بھی بٹھالیتا ہے، رشتہ داروں کا سامان رکھ کر اِدھر اُدھر پہنچادیتا ہے، بغیر اِجازت ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب:- آپ نے صحیح سمجھا، بغیر اِجازت اس گاڑی کو ذاتی کاموں میں خود اِستعمال کرنا یا کسی اور سے کروانا جائز نہیں۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

***

(۱و۲) وفی مسند احمد رقم الحدیث: ۱۹۰۵۳ ج:۱۴ ص:۳۹۷ و ۳۹۸ (طبع دارالحدیث القاھرۃ) عن جریر رضی اللہ عنہ قال: أتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت: ابایعک علی الإسلام! فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واشترط علیّ النصح لکل مسلم فبایعتہٗ علیٰ ھٰذا ورب ھٰذا المسجد انّی لکم لناصح جمیعًا ثم استغفر ونزل.

(۳) فتح القدیر، کتاب الغصب ج:۸ ص:۲۴۳ و ۲۴۴ (طبع رشیدیہ) الغصب فی اللغة: أخذ الشیء من الغیر علیٰ سبیل التغلب للاستعمال فیہ. وفی الشریعة: أخذ مال متقوم محترم بغیر اذن المالک علی وجہٍ یزیل یدہ.

(۴) فی الدرّ ج:۶ ص:۲۰۰ لا یجوز التصرف فی مال غیرہ بلا اذنہ ولا ولایتہ...اھ.

کتاب الجہاد

(جہاد اور قتال کے مسائل کا بیان)

مسلم علاقے پر قبضہ کرنے والے کافر حکمران سے مسلمانوں کو طاقت ہونے کی صورت میں جہاد کرنا چاہئے، نیز ایسے حکمران کے ماتحت ملازمت اور حقوق حاصل کرنے کا حکم (فارسی فتویٰ)

سوال۱:- حکمران کافر چند قریٰ و امصار را بتغلب واستیلا از دست مسلمانان سلب کرد و رعایائے مسلمانان کہ مغلوب قوانین او ہستند دران ادیار می باشند وہماں حکمران بعد از سلب دیار با ایشاں حیلے ترحم دارد، وبخششہا می کند، مگر اینکہ ہمیشہ درپئے آنست کہ قوانین اسلامی را از بین ببرد وکفر وزندقہ جاری گرداند مگر بسیاست وتلطف، نہ بزور وزجر مثلاً تعلیم جدید خود وآزادی زنان وافشائے زنا وشراب وسینما وغیرہا ترویج می دہد، وبمدارس دینی وپردہ راضی نیست، آیا با این حکمران ودستگاہان او چون محاربین در ترکِ موالات وغیرہ زندگی باید کرد یا کہ نہ؟

سوال۲:- واز ادارہائے اوقافیہ شان مزدور شدہ وحقوق گرفتن ودر سازمانہائے جدید دادہ حقوق گرفتن بغرض آنکہ اصلاح بچگان مسلمان بکنند ودیگر مامور ومزدوری نزدشان کردن جائز است یا کہ نہ؟ ودرین پول حقوق کدام قسم حرمت یا کراہت یا شب می آید یا نہ؟ وبالخصوص علماء ومقتدیاں یاں را این افعال چگونہ اند۔

سوال۳:- واگر اینہا بہ مسلمانی پول بدھند کہ برائے من حج کن آیا احرام باینہا یا بہمان پول او احرام بخود بفریب بستن روا است یا نہ؟

سوال۴:- تعلقات با کفّار قائم کردن وتعظیم شعائر کفر روا است؟

سوال۵:- واعانت این حکمران را در مدرسۂ اسلامیہ گرفتہ استعمال کردہ روا است یا نہ؟

سوال۶:- واگر مرتکب اُمور مذکورہ کدام اہل علمی یا شیخی باشد، بہ او چہ اعتقاد باید کرد وایا ملامت او غیبت او وتردید این عمل را چہ حکم دارد۔ بینوا توجروا۔

جواب ا:- اگر مسلمانان را چندے قوت و استطاعت ہست کہ با او محاربہ کردہ حکومتش را زائل نمایند و حکومتِ اسلامی قائم کنند، بر مسلماناں حکومت اسلامی قائم کردن واجب است،(۱) واگر آنہا چنیں استطاعت و قوت نہ دارند، پس آنہا را صبر باید کرد،(۲) تا آنکہ قوت حاصل شود،(۳) واندریں زمانۂ مغلوبیت انتظاماتِ مناسب برائے حفاظتِ دین واجب ہستند، چوں تعمیر مساجد و اقامتِ مدارس دینی و وعظ و تبلیغ، تا کہ مسلماناں بر ایمان سلامت باشند، واگر آں حکمران بر ترکِ احکام دینی جبر و تشدد نماید، واستطاعت مقاومت او نہ باشد پس اندران وقت ہجرت بر مسلمین واجب شود۔(۴)

(۱ تا ۳) وفی بدائع الصنائع، کتاب السیر ج:۷ ص:۹۸ وأمّا بیان من یفترض علیه فنقول أنّه لا یفترض الّا علی القادر علیه فمن لا قدرة لهٗ لا جهاد علیه، لأنّ الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطّاقة بالقتال أو المبالغة فی عمل القتال ومن لا وسع لهٗ کیف یبذل الوسع.

وفی الهندیة، کتاب السیر، الباب الأوّل فی تفسیره ج:۲ ص:۱۸۸ (طبع رشیدیه) وأمّا شرائط اباحته فشیأن أحدهما امتناع العدوّ عن قبول ما دعی الیه من الدین الحق وعدم الامان والعهد بیننا وبینهم والثّانی ان یرجوا الشوکة والقوّة لأهل الاسلام باجتهاده .... لما فیه من القاء نفسه فی التّهلکة وکذا فی البحر الرّائق، کتاب السیر ج:۵ ص:۷۲ (طبع سعید).

وفی الدّر المختار، کتاب الجهاد ج:۴ ص:۱۲۷ (طبع سعید) ولا بدّ لفرضیته من قیدٍ آخر هو الاستطاعة .... وشرط لوجوبه القدرة علی السلاح لا أمن الطّریق فان علم انّه اذا حارب قتل وان لم یحارب أُسر لم یلزمه القتال ....الخ.

وفی بدائع الصنائع ج:۷ ص:۹۸ فأمّا اذا عمّ النّفیر بان هجم العدوّ علیٰ بلدٍ فهو فرض عین یفترض علیٰ کل واحدٍ من آحاد المسلمین ممّن هو قادرٌ علیه ..... الخ.

(۴) وفی تفسیر المدارک ج:۱ ص:۳۴۲ (طبع قدیمی) والآیة (اَلَمْ تَکُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا) تدلّ علیٰ أن من لَم یتمکن من اقامة دینهٖ فی بلدٍ کما یجب وعلم أنّه یتمکن من اقامتهٖ فی غیرهٖ حقّت علیه المهاجرة.

وفی التفسیرات الأحمدیة ص:۳۰۵ (طبع کریمی کتب خانه بمبئی) وفی هٰذا الزّمان ان لم یتمکّن من اقامة دینهٖ بسببِ أیدی الظلمة أو الکفرة یفرض علیه الهجرة وهو الحق.

وفی أحکام القرآن للقرطبیؒ ج:۵ ص:۳۳۲ (طبع دار الکتاب العربی) الهجرة وهی الخروج من دار الحرب الی دار الاسلام وکانت فرضًا فی أیام النبی صلی الله علیه وسلم وهٰذه الهجرة باقیة مفروضة الیٰ یوم القیامة.

وکذا فی التفسیر المظهری ج:۲ ص:۲۰۷ (طبع حافظ کتب خانه کوئٹه).

وفی تکملة فتح الملهم، کتاب الامارة ج:۳ ص:۳۷۳ (طبع مکتبه دارالعلوم کراچی) .... الأوّل قادر علی الهجرة منها لا یمکنه اظهار دینه ولا أداء واجباته فالهجرة منه واجبة .....الخ.

وفی عمدة القاری شرح صحیح البخاری، باب المداراة مع الناس ج:۲۲ ص:۲۶۲ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) المداهنة محرمة والفرق بینهما أنّ المداهنة هی أن یلقی الفاسق المعلن بفسقه فیؤالفهٗ ولا ینکر علیه ولو بقلبه.

وفیها أیضًا باب ما قیل فی ذی الوجهین ج:۲۲ ص:۲۰۱ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) المداهنة المحرمة وسمی ذو الوجهین مداهنًا لأنه یظهر لأهل المنکر .... فیخلطه لکلتا الطّائفتین واظهاره الرّضیٰ بفعلهم استحق اسم المداهنة واستحق الوعید الشدید أیضًا.

وفی فتح الباری، باب المداراة مع الناس ج:۱۷ ص:۳۱۷ المداهنة محرّمة والفرق أن المداهنة من الدّهان وهو الّذی یظهر علی الشیء ویُستتر باطنه وفسرها العلماء بأنّه معاشرة الفاسق واظهار الرّضاء بما هو فیه من غیر انکار علیه.

(باقی اگلے صفحے پر)

جواب۲:- زیر حکومتِ آن حکمرانِ کافر ملازمت کردن و پول حقوق گرفتن جائز است بشرطیکہ آن خدمت فی نفسہا حرام و ناجائز نہ باشد و دران اعانتِ معصیت لازم نیاید اندریں پول ہیچ کراہت نیست۔

جواب۳:- سوال واضح نیست حکمرانِ کافر چرا گوید کہ ”برائے من حج کن“۔

جواب۴:- درصورتِ عدم استطاعت محاربہ تعلقات باکفار قائم کردن رواست البتہ مداہنت وتشبہ بالکفار وتعظیم شعائر کفر بدونِ حالتِ اضطرار جائز نیست۔

جواب۵:- رواست۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..... وفی شرح ابن بطّال، الباب رقم:۸ ج:۱۵ ص:۲۷۰ قال المؤلّف لا ینبغی لمؤمن أن یثنی علیٰ سلطان أو غیره فی وجهه وهو عندهٗ مستحق للذّم ولا یقول بحضرته بخلاف ما یقول اذا خرج من عنده لأنّ ذٰلک نفاق کما قال ابن عمر وقال فیه صلی الله علیه وسلم: ”شر الناس ذو الوجهین“ وقال: انه لا یکون عند الله وجیهًا لأنّه یظهر لأهل الباطل الرّضا عنهم ویظهر لأهل الحق مثل ذٰلک لیرضیٰ کل فریق منهم ویریه أنّه منهم وهذه المداهنة محرمة علی المؤمنین.

وفی مرقاة المفاتیح شرح المشکوٰة، باب الأمر بالمعروف ج:۹ ص:۳۳۱ (طبع مکتبه امدادیه ملتان) المداهنة فی الشریعة أن یریٰ منکرًا ویقدر علیٰ دفعه ولم یدفعه حفظًا لجانب مرتکبه أو جانب غیره لخوف أو طمع أو لاستحیاء منه أو قلة مبالاة فی الدین ...الخ.

وفی بدائع الصنائع، فصل فی بیان ما یعترض من ....الخ ج:۱۵ ص:۳۳۹ انّ ذٰلک مباحٌ فکان اظهار شعائر الکفر فی مکان معدّ لاظهار شعائر الاسلام وهو أمصار المسلمین فیمنعون من ذٰلک وکذا یمنعون من ادخالها فی أمصار المسلمین ظاهرًا ..... ولا یمکنون من اظهار صلیبهم فی عیدهم لأنّه اظهار شعائر الکفر فلا یمکنون من ذٰلک فی أمصار المسلمین ..... والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریة أو موضع لیس من أمصار المسلمین ولو کان فیه عدد کثیر من أهل الاسلام وانّما یکره ذٰلک فی أمصار المسلمین وهی الّتی یقام فیها الجمع والأعیاد والحدود لأنّ المنع من اظهار هٰذه الأشیاء لکونه اظهار شعائر الکفر فی مکان اظهار شعائر الاسلام فیختص المنع بالمکان المعدّ لاظهار شعائر ....الخ. وفیه بعد صفحة ..... الممنوع اظهار شعائر الکفر فی مکان اظهار شعائر الاسلام وهو أمصار المسلمین.

وفی البحر الرّائق، بیع العصیر من خمار ج:۸ ص:۲۰۲ و۲۰۳ (طبع سعید) لا یمکنون من ذٰلک فی الأمصار ولا یمکنون من اظهار بیع الخمر والخنزیر فی الأمصار لظهور شعائر الاسلام فلا یعارض بظهور شعائر الکفر قالوا فی هذا سواد الکوفة لأنّ غالب أهلها أهل ذمّة.

وفی تبیین الحقائق شرح الکنز ج:۴ ص:۱۶۴ (طبع سعید) باب العشر والخراج والجزیة: الأمصار هی الّتی تقام فیها شعائر الاسلام فلا یعارض باظهار ما یخالفها ولهٰذا یمنعون من بیع الخمر والخنازیر وضرب الناقوس خارج الکنیسة فی الأمصار لما قُلنا ولا یمنعون من ذٰلک فی قریة لا تقام فیها الجمع والحدود وان کان فیها عددٌ کثیر لأنّ شعائر الاسلام فیها غیر ظاهرة وقیل یُمنعون فی کل موضع لم تشع فیه شعائرهم لأنّ فی القریٰ بعض الشعائر فلا تعارض باظهار ما یخالفها من شعائر الکفر ....الخ.

وفی الفتاویٰ الکبریٰ (من یفعل من المسلمین مثل طعام ....الخ) ..... قد ذهب طائفة من العلماء الیٰ کفر من یفعل هٰذه الأمور لما فیها من تعظیم شعائر الکفر .....الخ.

جواب:۶ - جواب ایں سوال از اَجوبہ سابقہ واضح ہست۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۴/۲۷ و)

(ترجمہ) سوال:- کسی کافر حکمران نے زبردستی مسلمانوں سے چند بستیاں اور شہر چھین لئے، اور مسلمان رعایا جو اُس کے قوانین کے ماتحت ہیں وہ انہی شہروں میں رہتے ہیں اور وہ حکمران علاقے چھین لینے کے بعد ان کے ساتھ بہت نرمی برتتا ہے اور بہت بخشش (یعنی عطایا، حسنِ سلوک) کرتا ہے۔

لیکن وہ ہمیشہ اس کے درپے رہتا ہے کہ اسلامی قوانین کو ختم کردے، اور کفر و زِندیقیت کو رِواج دے، مگر یہ سب کچھ وہ سیاست اور نرمی سے کرے نہ کہ اپنی طاقت اور سختی کے بل بوتے پر، مثلاً اپنی بنائی ہوئی جدید تعلیم، عورتوں کی آزادی، کھلے عام زنا، شراب کا اِستعمال اور سینما وغیرہ کو ترویج دے اور دِینی مدارس اور پردے پر راضی نہ ہو۔ تو کیا اس حکمران اور اس کے حواریوں کے ساتھ محاربین کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً ترکِ موالات کیا جائے یا نہیں؟

۲:- ان کے محکمہ اوقاف کے اِداروں میں مزدوری کرنا اور حقوق حاصل کرنا اور دیگر حقوق لینا اس غرض سے کہ مسلمان بچوں کی اصلاح کریں، دیگر معاملات اور نوکری کرنا ان کے ہاں جائز ہے یا نہیں؟ اور اس تنخواہ کے پیسوں میں کسی قسم کی حرمت، کراہت یا شبہ آتا ہے یا نہیں؟ بالخصوص علماء اور مقتدیوں کی شان میں یہ افعال کیسے ہیں؟

۳:- اگر ان میں سے کوئی کسی مسلمان کو پیسے دیں اور کہے کہ میری طرف سے حج کرو تو کیا ان کے حج کے اِحرام کو جو اُنہی کے پیسوں سے ہیں اپنے لئے دھوکے کے ساتھ اِحرام باندھ سکتے ہیں یا نہیں؟

۴:- کفار کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور شعائرِ کفر کی تعظیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵:- اس حکمران کے مالی تعاون کو لے کر اِسلامی مدارس پر خرچ کیا جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

۶:- اگر ان مذکورہ اُمور کا مرتکب کوئی اہلِ علم ہو یا کوئی شیخ ہو تو اس کے بارے میں کیا اِعتقاد رکھنا چاہئے؟ اسی طرح اس کو ملامت کرنا، اس کی غیبت کرنا اور اس کے اس عمل کی تردید کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

(ترجمہ) جواب:- اگر مسلمانوں میں اتنی قوت و طاقت ہو کہ اس کے ساتھ جہاد کرکے اس کی حکومت کو ختم کردیں اور اِسلامی حکومت نافذ کریں، تو مسلمانوں پر اِسلامی حکومت کا قیام واجب ہے۔

لیکن اگر اُن میں اتنی قوت و طاقت نہ ہو کہ اُس کی حکومت کو ختم کرسکیں تو ان کو صبر کرنا چاہئے، یہاں تک کہ ان کو اس کی قوت حاصل ہوجائے، اور اِس مغلوبیت کے دور میں بھی اُن پر حفاظتِ دِین کے لئے مناسب اقدامات کرنا واجب ہے، مثلاً مساجد کی تعمیر، دِینی مدارس کا قیام اور وعظ و تبلیغ وغیرہ تاکہ مسلمان ایمانِ سالم پر ہی رہیں۔

اور اگر وہ کافر حکمران اَحکامِ دِینیہ کے ترک پر جبر و تشدّد کرے اور مسلمانوں میں اُس کے مقابلے کی سکت نہ ہو تو اُس وقت اُن پر ہجرت کرنا واجب ہوجائے گا۔

۲:- اُس کافر حکمران کی ماتحتی میں ملازمت کرنا، اور اپنے حق کی تنخواہ لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ خدمت و ملازمت بنفسہٖ حرام اور ناجائز نہ ہو، اور اُس ملازمت میں معصیت کی اعانت بھی لازم نہ آئے، اور اس پیسے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

۳:- یہ سوال واضح نہیں، یعنی وہ بادشاہ (کافر حکمران) یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ میرے لئے حج کرو۔

۴:- اگر کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی طاقت نہیں، تو اِس صورت میں اُن کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے، البتہ یہ بات ہے کہ تشبہ بالکفار، مداہنت اور شعائرِ کفر کی تعظیم کرنا حالتِ اِضطرار کے بغیر جائز نہیں ہے۔

۵:- جائز ہے۔

۶:- اِس سوال کا جواب سابقہ اَجوبہ سے معلوم ہوچکا۔

عراق میں امریکی افواج کے تعاون کے لئے پاکستانی افواج بھیجنے کا حکم

سوال:- حکومتِ پاکستان، امریکا کی درخواست پر پاکستانی افواج عراق بھیجنے کا ارادہ کر رہی ہے، کیا حکومتِ پاکستان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی افواج عراق بھیج کر امریکا کے ساتھ تعاون کرے؟

جواب:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ.

موجودہ حالات میں جبکہ عراق پر امریکا نے سراسر ظالمانہ قبضہ کیا ہوا ہے، حکومتِ پاکستان یا کسی بھی مسلمان حکومت کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ان کے تعاون کے لئے وہاں اپنی فوجیں بھیجے، جس کی مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں:-

۱:- امریکا نے عراق پر حملہ کر کے جس طرح ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا ہے، اور نہ صرف اسلام بلکہ دُنیا بھر کے مُسلَّم قانونی اور اَخلاقی ضابطوں کو پامال کرنے کی متکبرانہ جسارت کی ہے، اس کے کہنے پر وہاں فوجیں بھیجنا، اس کے اس سراسر ظالمانہ حملے کی تائید ہے، جس کے حرام ہونے پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲:- امریکا عراق پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد وہاں اپنے قبضے کو مستحکم کرنے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے مختلف ملکوں سے اپنی فوجیں بھیجنے کی درخواست کر رہا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے صورتِ حال یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک پر کوئی غیرمسلم قوم حملہ کرے، تو ضرورت کے وقت تمام مسلمانوں پر اس کا دِفاع واجب ہے، اور اگر کوئی غیرمسلم قوم مسلمان ملک پر قبضہ کرلے، تو تمام مسلمان حکومتوں پر واجب ہے کہ اس قبضے کو جلد از جلد ختم کرانے کے لئے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائیں، ظاہر ہے ایسے حالات میں قبضہ ختم کرانے کے بجائے اس ظالمانہ قبضے کو مزید مستحکم کرانے کی کوشش سراسر حرام اور ناجائز ہے۔

۳:- امریکا کے عراق پر فوجی طاقت مسلط کرنے کے باوجود عراق کے مسلمان امریکی قبضے کی مسلسل مزاحمت اور مقاومت کر رہے ہیں، جس کا انہیں پورا حق حاصل ہے، ایسے حالات میں عالمِ اسلام کا فرض ہے کہ وہ ان عراقی مسلمانوں کی مدد اور حمایت کرے۔ اس صورتِ حال میں اپنی فوجوں کو امریکا کے زیرِ کمان دینے کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ مسلمان فوجوں کو ان عراقی مسلمانوں کے مدِمقابل لاکھڑا

کیا جائے۔ یہ دعویٰ کہ افواجِ پاکستان کو عراق میں قیامِ امن کے لئے دعوت دی جارہی ہے، خود اس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں عراق کے ان مسلمانوں سے ٹکرایا جائے گا، جو امریکی قبضے کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم غاصبوں کی اِمداد قرآن و سنت کی صریح نصوص کے بالکل خلاف ہے، جس کے حرام ہونے میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہوسکتا، قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّىْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ. (الممتحنہ:۱)

ترجمہ:- اے ایمان والو! میرے دُشمن اور اپنے دُشمن کو اپنا ولی نہ بناؤ کہ ان سے دوستی کے ڈول ڈالنے لگو جبکہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے۔

یہ آیت جس واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے، اس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے صرف اتنا کیا تھا کہ ان کے جو اعزّہ اقرباء مکہ مکرّمہ میں مقیم تھے ان کی مصلحت کے پیشِ نظر کفارِ مکہ کو یہ خبر بھیجنی چاہی تھی کہ ان پر حملے کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ (صحیح بخاری)[1]

اگرچہ اس واقعے سے مسلمانوں کو کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں پہنچا، لیکن قرآنِ کریم کی مذکورہ بالا آیات نے اس اِقدام پر شدید گرفت فرمائی (تفسیر ابن کثیر ج:۴ ص:۳۴۵)[2] اور آئندہ کے لئے یہ مستقل قانون بنادیا کہ غیر مسلم طاقتوں سے بے گناہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تعاون اور دوستی کسی صورت جائز نہیں۔ اسی سورت میں آگے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے:-

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيٰرِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰۤى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (الممتحنہ:۸،۹)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ جن (کافر) لوگوں نے تم سے دِین کے معاملے میں جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ تم حسنِ سلوک اور اِنصاف کا معاملہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ اِنصاف

(۱) الصحيح للبخارى باب غزوة الفتح وما بعث حاطب بن أبى بلتعة الىٰ أهل مكة يخبرهم بغزو النبى صلى الله عليه وسلم رقم الحديث:۴۲۷۴ ج:۲ ص:۲۱۲ (طبع قديمى كتب خانه)

(۲) (طبع قديمى كتب خانه).

کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے روکتا ہے کہ جن لوگوں نے تم سے دِین کے معاملے میں لڑائیاں کیں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالے جانے کے لئے ایک دُوسرے کی مدد کی، ایسے لوگوں کے تم معاون بنو، اور جو ان کی معاونت کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

ان آیات میں پوری صراحت کے ساتھ ایسے غیر مسلموں کی ہم نوائی اور اِعانت کو حرام قرار دیا گیا ہے جو مسلمانوں سے جنگ کریں اور انہیں خانماں برباد کریں، یا اس کام میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔ امریکا نے خود بھی ہزارہا مسلمانوں کو وحشیانہ طریقے پر بربریت کا نشانہ بنایا ہے اور ہزارہا مسلمانوں کو خود بھی بے گھر کیا ہے، اور اِسرائیل کی بھرپور مدد بھی کی ہے جو سالہا سال سے ان جرائم کا مرتکب ہے، لہٰذا وہ اس آیت کے مفہوم میں بلاشک وشبہ داخل ہے، اور اس کی اِعانت پر یہ آیت مکمل طور سے صادق آتی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف کافروں سے دوستانہ تعاون کی حرمت متعدّد آیات میں مختلف عنوانات سے بیان فرمائی گئی ہے، خاص طور پر مندرجہ ذیل آیاتِ کریمہ مسلمانوں کے لئے سرمۂ بصیرت ہیں:-

اَلَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا. (النساء:۱۳۹)

ترجمہ:- یہ وہ لوگ ہیں جو مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست ہم نوا بناتے ہیں، کیا یہ ان کے پاس عزّت تلاش کرتے ہیں؟ تو (یہ سمجھ لیں کہ) عزّت تمام تر اللہ کے قبضے میں ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ عَلَیْکُمْ سُلْطَانًا مُّبِیْنًا. (النساء:۱۴۴)

ترجمہ:- اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے خلاف ایک کھلی حجت دے دو؟

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ، بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ، وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ، اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ. (المائدۃ:۵۱)

ترجمہ:- اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دُوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی انہیں دوست بنائے گا تو وہ انہیں میں شمار ہوگا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

(المائدۃ:۵۷)

ترجمہ:- اے ایمان والو! تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی، ان میں سے جنھوں نے تمہارے دِین کو ہنسی کھیل بنایا ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ، اور اللہ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو۔

۴:- مذکورہ بالا آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات کی روشنی میں فقہائے اُمت نے یہ اُصول بیان فرمایا ہے کہ کسی مشترک دُشمن کے خلاف بھی غیرمسلموں سے مدد لینا یا ان کی مدد کرنا صرف اس صورت میں جائز ہے جب وہ غیرمسلم مسلمانوں کے پرچم تلے جنگ کریں، اور جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کا حکم غالب ہو۔ اِمام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت کے تحت فرماتے ہیں:-

وھٰذا یدل علی انہ غیر جائز للمؤمنین الاستنصار بالکفار علیٰ غیرھم من الکفار اذ کانوا متی غلبوا کان حکم الکفر ھو الغالب.

(احکام القرآن ج:۲ ص:۳۵۲)(۱)

ترجمہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں دُوسرے کفار سے ایسی حالت میں مدد لیں جب فتح کی صورت میں کفر کا حکم غالب ہو۔

نیز اِمام محمد رحمہ اللہ "السیر الکبیر" میں فرماتے ہیں:-

لا بأس بأن یستعین المسلمون بأھل الشرک علیٰ أھل الشرک اذا کان حکم الاسلام ھو الظاھر علیھم. (شرح السیر الکبیر ج:۳ ص:۱۸۶)(۲)

ترجمہ:- مسلمان اگر اہلِ شرک کے مقابلے میں دُوسرے اہلِ شرک سے مدد لیں تو اس میں اس وقت کچھ حرج نہیں ہے جب اسلام کا حکم ان پر غالب ہو۔

دُوسری طرف اگر کوئی غیرمسلم قوم کسی دُوسری غیرمسلم قوم سے لڑنے کے لئے مسلمانوں کو دعوت دیں تب بھی اصل حکم یہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان میں سے کسی بھی فریق کی مدد کرنا جائز

(۱) باب استتابۃ المرتد (تحت آیۃ) بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (الآیۃ) ج:۲ ص:۳۶۱ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت).

(۲) باب الاستعانۃ بأھل الشرک واستعانۃ المشرکین بالمسلمین.

نہیں ہے۔ البتہ اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر غیر مسلموں کی یہ دعوت قبول نہ کی گئی تو وہ خود مسلمانوں کو بھی قتل کر ڈالیں گے تب ان کی مدد کرنا جائز ہوگا۔ اِمام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

لا ينبغي للمسلمين أن يقاتلوا أهل الشرک مع أهل الشرک .... ولو قال أهل الحرب لاسراء فيهم قاتلوا معنا عدوّنا من المشركين وهم ..... فاذا كانوا يخافون اولٰئک الآخرين علىٰ أنفسهم فلا بأس بأن يقاتلوهم.[1]

ترجمہ:- مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اہلِ شرک کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر دُوسرے اہلِ شرک سے جنگ کریں اور اگر اہلِ حرب نے مسلمان قیدیوں سے کہا کہ ہمارے مشرک دُشمن سے ہمارے ساتھ لڑو اور وہ خود بھی مشرک ہے، تو اگر ان قیدیوں کی ان مشرکوں کی طرف سے اپنی جان کا خوف ہو تو ان کے لئے جائز ہوگا کہ وہ ان کے ساتھ مل کر ان کے دُشمن مشرکوں سے لڑیں۔

(شرح السیر الکبیر ج:۳ ص: ۲۴۱، ۲۴۲)[2]

یہ سب کچھ اس وقت ہے جب غیر مسلموں کے ساتھ مل کر دُوسرے غیر مسلموں سے جنگ کی جارہی ہو، لیکن اگر غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمان ہوں اور پھر غیر مسلم اپنے ساتھ مل کر اپنے مدِمقابل مسلمانوں سے لڑنے کی دعوت دیں، تو اس دعوت کا قبول کرنا حالتِ اِضطرار میں بھی جائز نہیں ہے، یعنی اگر مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر ہم نے غیر مسلموں کا یہ مطالبہ نہ مانا کہ ان کے ساتھ مل کر دُوسرے مسلمانوں سے لڑا جائے، تو یہ غیر مسلم خود ہمیں قتل کر ڈالیں گے، تب بھی ان کا یہ مطالبہ ماننا مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، خواہ اسے خود اپنی جان دے دینی پڑے۔ اِمام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

وان قالوا لهم قاتلوا معنا المسلمين وإلّا قتلناكم، لم يسعهم القتال مع المسلمين.

ترجمہ:- اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑو ورنہ ہم تمہیں قتل کردیں گے، تب بھی ان کے لئے مسلمانوں سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اِمام سرخسی رحمہ اللہ اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

لأنّ ذٰلک حرام على المسلمين بعينه فلا يجوز الاقدام عليه بسبب

(۱ و ۲) باب ما يسع من الرجل أن يفعل ايهما شاء.

التهديد بالقتل كما لو قال له: اقتل هٰذا المسلم وإلّا قتلتك.

(شرح السير ج:۳ ص:۲۴۲)(۱)

ترجمہ:- اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے دُوسرے مسلمانوں سے جنگ حرام لعینہ ہے، لہٰذا قتل کی دھمکی کی صورت میں بھی ایسا اِقدام جائز نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اس شخص کو قتل کرو ورنہ میں تمہیں قتل کرتا ہوں (کہ اس دھمکی کی وجہ سے دُوسرے کو قتل کرنا جائز نہیں)۔

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کی افواج کو جن کے مقاصدِ وجود اور بنیادی اُصولوں میں ''جہاد'' شامل ہے اور جن کے ملک کے دستور میں عالمِ اسلام کے مسلمانوں سے وفاداری کا عہد شامل ہے، عراق کے ان مسلمانوں کے خلاف صف آراء کردینا جو امریکا کے جبر و اِستبداد اور اس کے ظالمانہ تسلط کے خلاف جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں، قرآن وسنت کی صریح نصوص اور اُمت کے اِجتماعی ضمیر کے خلاف تو ہے ہی، خود پاکستان کے دستور اور اَفواجِ پاکستان کے مقاصد کے بھی خلاف ہے۔ اور اگر خدانخواستہ یہ سراسر ناجائز قدم اُٹھایا گیا تو اَفواجِ پاکستان کی عزّت و وقار اور ان کی نیک نامی پر ایک بدترین دھبّہ لگانے کے مرادف ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	محمد تقی عثمانی
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	احقر محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	۱۴۲۴/۶/۱۲ھ
۱۴۲۴/۶/۱۲ھ	۱۴۲۴/۶/۱۳ھ	(فتویٰ نمبر ۸۶/۲۳۶)

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے جلوسوں میں مرنے والے ''شہید'' ہیں یا نہیں؟

سوال:- آج کل جو مسلمان نظامِ مصطفیٰ کی تحریکوں میں پولیس کی گولی سے مر رہے ہیں، یہ شہید ہیں یا نہیں؟ ایسے لوگوں کو غسل وکفن دیا جائے گا یا نہیں؟ یا اُنہی کپڑوں میں دفن کیا جائے گا جو وہ پہنے ہوئے ہیں؟

جواب:- جن لوگوں نے کسی عالم کے فتویٰ یا ترغیب کی بناء پر ان جلوسوں میں حصہ لیا اور نیک نیتی سے یہ سمجھ کر حصہ لیا کہ اسلام کے لئے جدوجہد کا یہی راستہ ہے، اور وہ ہلاک ہوگئے اِن شاء اللہ اُخروی اَحکام کے اعتبار سے وہ شہید ہوں گے، البتہ دُنیوی اَحکام کے لحاظ سے شہید قرار پانے کے

(۱) حوالہ سابقہ۔

لئے شرط یہ ہے کہ گولی لگنے یا زخمی ہونے کے فوراً بعد ان کی موت واقع ہوگئی ہو، اور زخمی ہونے کے بعد انہوں نے کچھ کھایا پیا نہ ہو، نہ کسی سے کوئی طویل بات چیت کی ہو، نہ ایک نماز کا پورا وقت پایا ہو، ایسے لوگوں کو غسل اور کفن کے بغیر نماز پڑھ کر دفن کیا جاسکتا ہے،(۱) اور اگر یہ شرائط نہ پائی گئیں تو پھر غسل وکفن ضروری ہے،(۲) وهٰذا لأن الخروج على الحكومات اليوم أمر مجتهد فيه، وحكمه على الاجتهاد، كما أن حجر بن عدى رحمه الله خرج علىٰ معاوية رضى الله عنه بعد استقرار خلافته وكان ذٰلك اجتهادًا منه وقد صرّح السرخسى فى المبسوط أنّه دفن فى ثيابه۔(۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۷/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷۷/۲۸ ج)

خلیج کی لڑائی کی شرعی حیثیت اور اس میں کس فریق کی جانب سے لڑنا "جہاد" تھا؟

سوال:- آپ صاحبان کو علم ہوگا کہ خلیج کے بحران کے بعد اَب عراق اور امریکا اور اس کے اتحادیوں کی افواج کے درمیان جنگ جاری ہے، اور اس جنگ کے حقائق سے آپ صاحبان بخوبی

(۱ و ۲) وفى الدّر المختار، باب الشهيد ج:۲ ص:۲۵۰ (طبع سعيد) .... فينزع عنه ما لا يصلح للكفن ويزاد ان نقص ما عليه عن كفن السُّنّة وينقص ان زاد لأجل ان يتم كفنه المسنون ويصلى عليه بلا غسل ويدفن بدمه وثيابه لحديث زملوهم بكلومهم ... الخ.

وفيه أيضًا ص:۲۵۰ الىٰ ۲۵۱ ويغسل من وجد قتيلًا فى مصر .... أو جرح وارتث وذٰلك بأن أكل أو شرب أو نام أو تداوى ولو قليلًا أو اوىٰ خيمة أو مضىٰ عليه وقت صلوٰة وهو يعقل ..... أو باع أو اشترىٰ أو تكلّم بكلامٍ كثير .... وكل ذٰلك فى الشهيد الكامل وإلّا فالمرتث شهيد الآخرة.

وفى الشامية تحته ج:۲ ص:۲۵۲ (قوله فى الشهيد الكامل) وهو شهيد الدُّنيا والآخرة وشهادة الدُّنيا بعدم الغسل إلّا لنجاسة أصابته غير دمه كما فى أبى السعود وشهادة الآخرة بنيل الثواب الموعود للشهيد .....الخ.

وكذا فى بدائع الصنائع ج:۱ ص:۳۲۴ (طبع سعيد).

وفى المبسوط للسرخسىؒ، باب الشهيد ج:۲ ص:۵۱ (طبع مطبع السعادة مصر) وقد ورد الأثر بغسل المرتث ومعناه ..... والأصل فيه أن عمر رضى الله عنه لمّا طعن حمل الىٰ بيته فعاش يومين ثم غسل وكان شهيدًا على لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم وكذٰلك على رضى الله عنه حمل حيًّا بعد ما طعن ثم غسل وكان شهيدًا وأمّا عثمان رضى الله عنه فاجهز عليه فى مصرعه ولم يغسل فعرفنا بذٰلك ان الشهيد الّذى لا يغسل من أجهز عليه فى مصرعه دون من حمل حيًّا .... الخ. وكذا فى البحر الرّائق، باب الشهيد ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع سعيد).

(۳) وفى المبسوط للسرخسىؒ، باب الشهيد ج:۲ ص:۵۰ (طبع مطبع السعادة مصر) قال ويكفن فى ثيابه الّتى هى عليه لقول رسول الله صلى الله عليه وسلم زمّلوهم بدمائهم وكلومهم ...... ولما استشهد عمار بن ياسر بصفين قال: لا تغسلوا عنى دمًا ولا تنزعوا عنّى ثوبًا فانّى التقى ومعاوية بالجادة وهٰكذا نقل عن حجر بن عدى غير أنّه ينزع عنه السلاح والجلد والفرو والحشو والخف والقلنسوة .....الخ.

واقف ہوں گے، ایک طرف عراق ہے جو کہ ایک اسلامی مملکت ہے، اور دُوسری طرف مختلف ممالک ہیں جن میں امریکا سرِفہرست ہے، اسی طرح برطانیہ اور فرانس بھی، لیکن ان کے علاوہ ان ممالک میں مسلم مملکتیں بھی عراق کے سامنے صف بستہ ہیں، جن میں سعودی عرب، مصر، ترکی وغیرہ ممالکِ اسلامیہ شامل ہیں، کیا ایک پاکستانی مجاہد ان کی جنگ میں شرکت کرسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی یہ جنگ اس مجاہد کے لئے جہاد فی سبیل اللہ ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس طرف سے؟ یعنی سعودی عرب کی طرف سے یا عراق کی طرف سے؟ خیال رہے کہ جو ممالک عراق کا ساتھ دے رہے ہیں ان میں غیرمسلم مملکت کوئی نہیں ہے، براہِ کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- خلیج کے علاقے میں جو جنگ جاری ہے وہ عالمِ اسلام کے لئے ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ابتداءً عراق نے کویت پر قبضہ کرکے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کیا، جس کا شرعاً کوئی جواز نہ تھا، اور سعودی عرب کے لئے ایک مظلوم کی حیثیت سے کویت کی مدد کرنا اور اگر خود اس کے اپنے علاقے کو اسی قسم کے حملے کا خطرہ ہو تو اس کے دِفاع کے لئے لڑنا بھی برحق تھا، بشرطیکہ جنگ کی قیادت خود اس کے یا کسی مسلمان ملک کے ہاتھ میں ہوتی، لیکن عملاً ہوا یہ کہ سعودی عرب نے جنگ کی مکمل کمان اور اس کی پالیسی کلی طور پر امریکا کے حوالے کردی، اس لئے اب عراق کی حمایت میں لڑنا تو اس لئے دُرست نہیں کہ اصلاً ظلم کی ابتدا اس کی طرف سے ہوئی، اور اگر وہ اس ظلم کا اِزالہ کرتے ہوئے کویت سے اپنا قبضہ اُٹھالے تو جنگ بند کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ اور دُوسری طرف اس کے خلاف حملے میں شریک ہونا اس لئے دُرست نہیں کہ اس جنگ کی کمان اب امریکا کے ہاتھ میں ہے جس نے اپنا یہ مقصد واضح کیا ہے کہ صرف کویت کو خالی کرانا مطمحِ نظر نہیں بلکہ عراق کی طاقت کو مکمل طور پر تباہ کرنا پیشِ نظر ہے، جس سے پورے عالمِ اسلام کی کمزوری لازمی ہے۔ اور جس جنگ میں کسی بھی طرف شرکت کرنا محذوراتِ شرعیہ سے خالی نہ ہو اسی کو اِصطلاح میں ''فتنہ'' کہا جاتا ہے، اور ایسے ہی فتنے کے موقع پر دونوں فریقوں سے علیحدہ رہنے کا حکم ہے۔ البتہ اس موقع پر یہ دُعا ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتفاق واتحاد پیدا فرمائے اور ان کی جان و مال اور عزّت و آبرو اور ان کی تنصیبات کی حفاظت فرمائے، اور ان کے دُشمنوں کو تباہ و برباد فرمائے، آمین۔

لقوله تعالیٰ: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا، فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ، فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا، اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ.

(الحجرات:۹)

ولقولهٖ تعالیٰ: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا. (النساء:۱۴۱)

وفی مشکوٰة المصابیح عن أبی سعید قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بها شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینه من الفتن. (رواه البخاری ص:۴۶۲)[1]

وعن المقداد بن الأسود قال: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: ان السعید لمن جنب الفتن، ان السعید لمن جنب الفتن، ان السعید لمن جنب الفتن، ولمن ابتلیٰ فصبر فواهًا. (رواه ابو داوٗد ص:۴۶۴)[2]

وعن أبی موسیٰ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم انه قال: ان بین یدی الساعة فتنًا کقطع اللیل المظلم (الیٰ قوله) ثم قالوا: فما تأمرنا؟ قال: کونوا احلاس بیوتکم. وفی روایة الترمذی ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: فی الفتنة کسّروا فیها قسیکم وقطعوا فیها اوتارکم والزموا فیها اجواف بیوتکم وکونوا کابن آدم. (ص:۴۶۴)[3]

وعنه (حذیفة) قال: (الیٰ قوله) قلت: یا رسول اللّٰه! صفهم لنا. قال: هم من جلدتنا ویتکلمون بألسنتنا، قلت: فما تأمرنی ان أدرکنی ذٰلک؟ قال: تلزم جماعة المسلمین وامامهم. قلت: فان لم یکن لهم جماعة ولا امام؟ قال: فاعتزل تلک الفرق کلها ولو ان تعض بأصل شجرة حتّی یدرکک الموت وأنت علیٰ ذٰلک. (متفق علیه ص:۴۶۲)[4]

وفی شرح السیر الکبیر: باب الاستعانة بأهل الشرک واستعانة المشرکین بالمسلمین:- ما نصه:- ولا بأس بأن یستعین المسلمون بأهل الشرک علی أهل الشرک اذا کان حکم الاسلام هو الظاهر (الیٰ ان قال) والذی روی أنّ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یوم أُحد رأی کتیبًا حسنا قال: من هٰؤلاء؟ فقیل: یهود بنی فلان حُلفاء بن ابی فقال: انّا لا نستعین بمن لیس علیٰ دیننا تأویله انهم کانوا أهل منعة وکانوا لا یقاتلون تحت رأیة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وعندنا اذا کانوا بهٰذه الصفة فانه یکره الاستعانة بهم (الیٰ قوله) وانما کره ذٰلک لأنهٗ کان معه سبعمأة من یهود بنی قینقاع من

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الدین الفرار من الفتن ج:۱ ص:۷ (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) سنن ابی داوٗد، کتاب الفتن، باب النّهی عن السعی فی الفتنة ج:۲ ص:۲۳۰ (طبع سعید).
(۳) سنن ابی داوٗد، کتاب الفتن، باب النّهی عن السعی فی الفتنة ج:۲ ص:۲۲۹ (طبع سعید).
(۴) مشکوٰة المصابیح ص:۴۶۱.

حلفائه فخشي ان يكونوا على المسلمين ان احسوا بهم زلة قدم فلهٰذا ردهم (وفيه بعد ذٰلک) حديث الزبير حين كان عند النّجاشي فنزل به عدوه فأبلىٰ يومئذٍ مع النّجاشي بلاءً حسنًا (الٰى قوله) ان النّجاشي كان مسلمًا (وبعد أسطر) قلنا ان ظهر على النّجاشي لم يعرف من حقنا ما كان النّجاشي يعرف فاخلصنا الدعاء الٰى ان يمكن الله النّجاشي[1] اهـ ملخصًا.

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	۲۱/۷/۱۴۱۱ھ
		(فتویٰ نمبر ۴۸/۷۲)

ضیاء الحق مرحوم کی موت شہادت ہے یا نہیں؟

سوال:- زید یہ کہتا ہے کہ ہمارے ملک کے مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا سانحہ مسلمانوں کے لئے باعثِ عبرت ہے، اس واقعے سے ہمیں سبق لینا چاہئے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے جو کہ ہمارے ملک کے شہید صدر اور ان کے رُفقاء پر نازل ہوا، اس طرح صدر ضیاء الحق کی موت شہادت نہیں ہے، بلکہ ہلاکت کی موت کہلائے گی۔ کیا زید کا یہ خیال دُرست ہے؟

جواب:- صدر مرحوم ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہوئے، اگر یہ حادثہ کسی شخص نے جان بوجھ کر انہیں قتل کرنے کے لئے کیا، تب تو وہ دُنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے شہید ہیں[2]۔ اور اگر یہ اتفاقی حادثہ تھا تو دُنیا کے لحاظ سے تو نہیں، البتہ اُخروی اَجر کے لحاظ سے شہید ہیں[3]، کیونکہ اُخروی اَجر کے لحاظ سے جو شخص آگ سے جل کر یا کسی چیز کے گرنے سے ہلاک ہو وہ بھی شہید ہوتا ہے[4]۔ اور

---

(۱) شرح السير الكبير، باب الاستعانة بأهل الشرک واستعانة المشركين بالمسلمين ج:۳ ص:۱۸۶ و ۱۸۷.

(۲) وفي الهندية، فصل في الشهيد ج:۱ ص:۱۶۸ (طبع رشيديه) ولو كان المسلمون في سفينة فرماهم العدوّ بالنّار ...... فاحترقوا فهم كلهم شهداء كذا في الخلاصة.

(۳ و ۴) وفي الشامية، باب الشهيد ج:۲ ص:۲۴۸ (طبع سعيد) لو مات حتف أنفه أو بترد أو حرق أو غرق أو هدم لم يكن شهيدًا في حكم الدنيا وان كان شهيد الآخرة.

وفي الدّر المختار، باب الشهيد ج:۲ ص:۲۵۲ والّا فالمرتث شهيد الآخرة وكذا الجنب ونحوه ...... الغريق والحريق والغريب والمهدوم عليه ..... الخ.

وفي المبسوط للسرخسيؒ، باب الشهيد ج:۲ ص:۵۲ (طبع مطبع السعادة مصر) ومن قتله السبع أو احترق بالنّار أو تردى من جبل أو مات تحت هدم أو غرق غسل كغيره من الموتىٰ .....الخ.

وفيه أيضًا ج:۲ ص:۵۱ ..... فيغسل وان كان له ثواب الشهداء كالغريق والحريق والمبطون والغريب يغسلون وهم شهداء علىٰ لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم .....الخ.

کسی شخص کے بارے میں اپنی طرف سے یہ فیصلہ کرنا کہ اس پر عذاب نازل ہوا ہے،[۱] بڑی جسارت کی بات ہے، جس سے ہر مسلمان کو پرہیز لازم ہے۔[۲]

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۴/۴۰ الف)

وسائل نہ ہونے کی صورت میں دعوت وتبلیغ اور وسائل میسر ہونے کی صورت میں جہاد کیا جائے گا اور جہاد کے لئے اِمام مہدیؒ کے انتظار اور تبلیغی جماعت کے نظریے کا حکم

سوال:- مکرمی جناب مفتی تقی عثمانی صاحب السلام علیکم!

اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے، حضرت! میں نے سوچا تھا کہ خود آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضری دُوں گا، لیکن مقام کی دُوری اور مصروفیات کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا، اس لئے بذریعۂ مکتوب آپ سے رُجوع کیا ہے۔

پہلے اپنا تعارف اور مکتوب کا مقصد بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا تعلق کسی دِینی تحریک یا جماعت سے باضابطہ طور پر نہیں ہے، لیکن آپ جیسے جید علمائے کرام اور بزرگانِ دِین کی زیارت اور صحبت کی نسبت سے دِین حاصل کرنے، اسے پھیلانے، اس کی حفاظت و بقاء اور نفاذ کا شوق دِل میں موجزن ہے۔

حضرت! میں کچھ عرصے سے تذبذب کا شکار ہوں کہ دِین کی کماحقہٗ اشاعت اور حفاظت کا دُرست اور مسنون راستہ کون سا ہے؟ اس بارے میں آپ کی رہنمائی چاہئے۔

پہلے چند باتیں جو ذہن میں ہیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، آپ جیسے جید علمائے کرام اور بزرگانِ دِین کی صحبت، تصانیف اور قرآن وحدیث کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکے میں دعوتِ دِین کا جو راستہ اور طریقہ اللہ ربّ العزّت کے حکم سے اختیار کیا، اس کے نتیجے کے طور پر تین سے چار سو کے لگ بھگ لوگ دِین میں داخل ہوئے، لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد جب جہاد کا حکم نازل ہوا اور صحابہؓ نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس حکم کو پورا کیا تو بارہ سال میں مختلف علاقوں کی فتوحات سے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ تک جا پہنچی۔ اسی طرح خلفائے

(۱ و ۲) وفی مرقاۃ المفاتیح ج:۱ ص:۲۶۷ فلا یحکم لأحدٍ بانه من أهل الجنّة ...... ولا یجزم فی حق أحدٍ بأنّهٗ من أهل النّار والعقوبات ولو صدر منهٗ جمیع السیئات والمظالم والتبعات فان العبر بخواتیم الحالات ولا یطلع علیها غیر عالم الغیب. وفیها أیضًا ج:۱ ص:۲۶۸ فرُبّ کافر متعند یسلم فی آخر عمره ورُبّ مسلم متعبد یکفر فی غایة أمره لا یجوز الشهادة لأحدٍ بالجنّة والنّار ..... الخ.

راشدینؓ کے زمانے میں بڑے بڑے ممالک کی فتوحات سے اسلام کا دائرہ وسیع ہوگیا تھا، اور چودہ سو سالہ تاریخ اس بات کی شاہد نظر آتی ہے کہ اسلام کی حفاظت و بقاء کے لئے صرف جہاد یعنی قتال ہی کارآمد ثابت ہوا۔

اسلام کی زیادہ سے زیادہ اور کما حقہٗ اشاعت بھی اسی سے ہوئی، جب کوئی علاقہ یا ملک فتح ہوا تو وہاں مبلغینِ اسلام کو آزادی سے اِشاعتِ دِین کا موقع ملا۔

اب موجودہ دور میں قتال فی سبیل اللہ کے پہلے کی طرح کما حقہٗ اثرات نظر نہیں آرہے، جبکہ علمائے دیوبند سے منسلک تحریک تبلیغی جماعت جو اَسّی (۸۰) سال سے اِشاعتِ دِین کی محنت کر رہی ہے اور جس کی محنت سے نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بہت زیادہ مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

اسی بات کے پیشِ نظر میں اِشاعتِ دِین اور حفاظتِ دِین کے متعلق مذکورہ بالا اپنی رائے یا دُوسرے الفاظ میں قرآن وحدیث کی چودہ سو سالہ تاریخ اور علمائے اُمت کی اکثریت کے موقف اور تبلیغی جماعت والوں کے موقف کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوں کہ آیا اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور حفاظت نیز اِشاعتِ اسلام کے لئے کونسا عمل مؤثر اور مفید ہے اور قرآن وسنت کے مطابق ہے؟

تبلیغی جماعت والوں کے موقف اور نظریات کو جو مجھ تک ''تبلیغی بزرگوں'' علماء اور کارکنوں کی زبانی پہنچے ہیں تفصیلاً سلسلہ وار بیان کرتا ہوں:-

۱:- بقول تبلیغیوں کے دِین کی اصل رُوح اور حقیقت ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' ہے، یہی تمام انبیاء کا کام تھا، اور اس میں اُمت کی نجات اور کامیابی ہے۔ (اس بات پر کما حقہٗ تبلیغی کتنا عمل کرتے ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا)۔

۲:- یہ دور جہاد وقتال کا دور نہیں ہے، بلکہ دعوت باللسان کا دور ہے۔

۳:- جب تک مہدی کا ظہور نہیں ہوتا، اس وقت تک جہاد اور اس سے منسلک تمام سرگرمیوں کو موقوف کر کے تبلیغی جماعت کے نظریے کے مطابق محنت کرنا تمام اُمت کے لئے ضروری ہے۔

۴:- اس دور میں جہادی سرگرمیوں میں حصہ لینا حکمت کے خلاف ہے، دِین کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

۵:- قرآن وحدیث میں جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی اِصطلاحات دو اَلگ معنوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

۶:- تبلیغِ دِین اور اِصلاحِ نفس کے مروّجہ طریقے جو اُمت کی اکثریت میں رائج ہیں، مثلاً خانقاہی نظام، دِینی رسائل واخبارات، اِصلاحی مواعظ، تحریر وتصنیف اور مدارس کا قیام وغیرہ یہ طریق

نبوّت سے مشابہت نہیں رکھتے، اور ''تبلیغی جماعت'' کا طریقِ دعوت نہ صرف دُرست اور منشائے خداوندی کے مطابق ہے بلکہ طریقِ نبی سے مماثلت اور مطابقت بھی رکھتا ہے۔

۷:- اگر اُمت میں بدری صحابہؓ کی تعداد کے بقدر لوگ انہی جیسے اعمال، ایمان، تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے حامل ہوجائیں تو خود بخود دُنیا کی کایہ ہی پلٹ جائے گی اور تبلیغی جماعت کا مقصد ہی ایسے لوگ پیدا کرنا ہے۔

۸:- دِین کو نافذ کرنے کا اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کا طالبان والا طریقہ حکمت کے خلاف اور دِین کی منشاء کے بھی خلاف ہے۔

۹:- دِین کا کوئی کام اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہوتا جب تک سنتِ رسول کے علاوہ بقول ''تبلیغیوں'' کے وہ عمل صفاتِ نبوی کے ساتھ نہ کیا جائے۔

۱۰:- اس دور میں دِین کی حفاظت، اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور اِسلام کے نفاذ کے لئے جہادی اور دُوسری تمام سرگرمیاں غیرمؤثر ثابت ہوچکی ہیں، لہٰذا مہدی کی آمد تک انہیں ترک کرکے ''تبلیغی جماعت'' والا کام شروع کیا جائے۔

۱۱:- اُمت ماسوائے ''تبلیغی جماعت'' کے کسی اور پلیٹ فارم پر متحد نہیں ہوسکتی۔

۱۲:- تبلیغی جماعت مہدی کا لشکر تیار کر رہی ہے۔

مندرجہ بالا بارہ عام پائے جانے والے ''تبلیغی نظریات'' میں نے گزشتہ چھ سال کے دوران رائے ونڈ اِجتماع اور اپنے علاقے کے شبِ جمعہ کے بیانات اور بہت سے تبلیغی علماء اور کارکنوں سے نقل اور اَخذ کئے ہیں۔

ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ''تبلیغی'' مذکورہ بالا نظریات ''غیرتبلیغیوں'' کے سامنے عموماً بیان نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو اشارۃً یا کنایۃً بیان کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ''غیرتبلیغی'' علماء تبلیغی جماعت کے نظریات کو جان نہیں سکتے۔

آپ حضرات (جو اس پُرآشوب اور پُرفتن دور میں اِستقامت کے ساتھ اِشاعتِ دِین، تعلیمِ دِین اور مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کام کر رہے ہیں) سے گزارش ہے کہ اس مسئلے کی طرف بھرپور توجہ فرمایئے، اور اس کی اپنی تقاریر، رسائل اور اپنے حلقۂ اَثر میں وضاحت فرمایئے کہ اس دور میں دِین کا کونسا عمل زیادہ مؤثر اور مفید نیز قرآن وسنت کے مطابق ہے جس کے ذریعے اِشاعتِ دِین، حفاظتِ دِین اور نفاذِ دِین کا عمل ہوسکے، اور آیا کہ تبلیغی جماعت کے مذکورہ نظریات اور موقف دُرست ہیں؟ دِین کے مطابق ہیں یا نہیں؟

ایک جید عالمِ دِین اور بزرگ ہونے کے ناطے آپ کا حلقۂ اَثر بھی زیادہ ہے اور آپ کے دلائل اور بات میں اللہ تعالیٰ نے قوّت اور اَثر رکھا ہے، اس لئے لوگ آپ کی بات کو آسانی سے سمجھتے

اور قبول کرتے ہیں، جبکہ میرے جیسے ناقصِ علم و عمل والوں کی بات کو ایک تو کوئی قبول نہیں کرتا، دُوسرے فتنہ وفساد پھیلنے کا اندیشہ بھی ہے۔

ان تمام گزارشات کے علاوہ عرض ہے کہ اپنی مہر اور دستخط کے ساتھ مدلل اور مفصل جواب اِرسال فرماکر میری رہنمائی فرمایئے کہ آیا میری رائے دُرست ہے یا کہ تبلیغی جماعت والوں کی؟ یا ان دونوں سے الگ قرآن و سنت میں کوئی دُوسرا عمل اور طریقہ جس کے ذریعے اُمت کی اِصلاح، مسلمانوں اور اِسلام کی حفاظت اور اِشاعت ونفاذِ دِین کا کام کماحقہٗ ہوسکے، موجود ہے؟ فقط

حافظ سمیع اللہ خان الیاس

جواب:- مختصر بات یہ ہے کہ جب جہاد کے ضروری وسائل مہیا نہ ہوں، دعوت و تبلیغ اور اَفراد سازی کے کام پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے، اس کے ساتھ جہاد کے ضروری وسائل مہیا کرنے کی فکر بھی جاری رکھنی چاہئے،(۱) جب وسائل مہیا ہوجائیں تو جہاد کرنا چاہئے۔(۲) یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ اِمام مہدی کے آنے تک جہاد موقوف ہے، یہ غلط نظریہ ہے، اوراس کی تردید و اِصلاح کے لئے اکابرِ تبلیغی جماعت سے بات بھی ہوئی ہے۔ جب بھی ضروری وسائل مہیا ہوجائیں، جہاد کرنا چاہئے،(۳) چاہے اِمام مہدی ابھی نہ آئے ہوں۔ البتہ ضروری وسائل مہیا کرنے میں آج کے حالات کے مطابق ایک طویل حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، جو ایک مختصر خط میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

والسلام

۱۴۲۳/۲/۱۷ھ

(۱ تا ۳) "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ" (الأنفال: ۶۰).

وفی تفسیر القرطبی ج:۸ ص:۳۵ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) أمر الله سبحانه المؤمنين باعداد القوّة للأعداء بعد أن أكّد تقدمة التقوىٰ .... قال ابن عباس: القوّة هاهنا السلاح والقسيّ ...... الخ.

وفی تفسیر ابن کثیر ج:۲ ص:۳۲۸ (طبع قدیمی کتب خانه) ثم أمر تعالىٰ بإعداد آلات الحرب لمقاتلتهم حسب الطّاقة والامكان والاستطاعة فقال (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ) أی مهما أمكنكم ......الخ.

وفی تفسیر المدارک ج:۱ ص:۵۹۷ (طبع قدیمی کتب خانه) (مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ) من كل ما يتقوّىٰ به فی الحرب من عددها ......الخ.

وفی تفسیر أبی السعود ج:۳ ص:۱۰۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) أعدّوا لقتال الّذين نُبذ اليهم العهد وهيّنوا لحرابهم .... ما استطعتم من قُوّة من كل ما يتقوّىٰ به فی الحرب كائنًا ما كان ......الخ.

وفی الدّر المختار ج:۴ ص:۱۲۷ (طبع سعید) وشرط لوجوبه القدرة على السّلاح لا أمن الطّريق.

وفی الشامية تحته: أی وعلى القتال وملك الزّاد والرّاحلة كما فی قاضی خان وغيره قهستانی ....الخ.

وفی تفسیر رُوح المعانی ج:۶ ص:۲۴ (طبع مکتبه امدادیه ملتان) (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ) خطاب لكافّة المؤمنين لما أن المأمور به من وظائف الكل أی أعدّوا القتال الذين نبذ اليهم العهد وهينوا لحرابهم (مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ) أی من كل ما يتقوّىٰ به فی الحرب كائنًا ما كان وأطلق عليه القوّة مبالغة، وانما ذكر هٰذا لأنه لم يكن له فی بدر استعداد تام فنبّهوا على أنّ النّصر من غير استعداد لا يتأتّی فی كل زمان. وعن ابن عباس رضی الله تعالىٰ عنهما تفسير القوة بأنواع الأسلحة.

وفی التفسیر الکبیر للامام الرازیؒ ج:۵ ص:۴۹۹ (طبع دار الحدیث ملتان) أمرهٗ فی هٰذه الآية بالاعداد لهؤلاء الكفّار ..... وأن يعدوا للكفّار ما يمكنهم من آلة وعدة وقوّة والمراد بالقوّة هٰهنا ما يكون سببًا لحصول القوّة وذكروا فيه وجوهًا الأوّل المراد من القوّة أنواع الأسلحة ..... قال أصحاب المعانی الأولىٰ أن يقال هٰذا عام فی كل ما يتقوّىٰ به علىٰ حرب العدوّ وكل ما هو آلة للغزو والجهاد فهو من جملة القوّة ...... الخ.

کتاب الامارۃ والسیاسۃ

(حکومت و اِمارت اور سیاست کے مسائل کا بیان)

دِین میں سیاست و اِقتدار کی حیثیت اور شرعی مقام اور دِین کا اصل مقصد

سوال:- فضائل مآب حضرتِ اقدس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے، ناچیز مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے فاضلیت کے علاوہ شعبۂ اِفتاء سے فراغت حاصل کرکے عرصے سے وادیٔ کشمیر کی مشہور شخصیت علامہ کشمیریؒ کے ننھیال رودھوان کپواڑہ میں ایک مدرسے میں تدریس و اِفتاء کا کام انجام دے رہا ہے۔

میں اور میرے دُوسرے رُفقاء جو الحمدللہ دارالعلوم دیوبند سے ہی فراغت حاصل کرچکے ہیں، تدریس و اِفتاء کے علاوہ مختلف مصنّفین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، الحمدللہ آپ کی تمام وہ کتابیں شوق و محبت سے پڑھی ہیں جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں، اور اس کی وجہ سے بربناء محبت دست بوسی ہی نہیں بلکہ قدم بوسی کو دِل چاہتا ہے۔ عرصے سے خط لکھنے کا ارادہ تھا لیکن ''عرفت ربّی بفسخ العزائم'' کا بار بار تجربہ ہوا، پھر سالِ گزشتہ حضرت تھانویؒ پر سیمینار کے سلسلے میں جناب کی دیوبند تشریف آوری کا چرچا ہوا، لیکن عین وقت پر جناب کے پروگرام کے ملتوی ہونے کی اطلاع ملی، اس لئے ملاقات بھی نہ ہوسکی۔ دِل تو بہت کچھ لکھنے کو چاہ رہا ہے، لیکن طولِ کلام کو بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے مختصراً اپنا مدّعا عرض کر رہا ہوں، اُمید ہے کہ حضرتِ والا اپنے بے حد قیمتی وقت کا خون کرکے جواب باصواب بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق پوری کتاب لکھ کر سرگرداں لوگوں کی تشویش اور پریشانی کو دُور فرمائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اُمت میں دو بڑے قلم کار صاحبِ طرز اِنشاء پرداز کی فکر عوام و خواص میں دو مستقل متضاد ذہن بنائے ہوئے ہے، ایک صاحب نے دِین کی تعبیر میں مقصود کو تقاضا، اور تقاضے کو مقصود بناکر دِین کو اس انسان کی طرح جس کے پیر اُوپر اور سر نیچا ہو عوام الناس کے سامنے پیش کیا، اور ایک اچھی خاصی بھیڑ اس نظریے پر جم گئی ہے۔ پھر اسی فکر کے ایک فعال شخص نے اس کے رَدّ میں ایک الگ اور مستقل فکر کی بنیاد ڈالی اور اپنے گمان کے مطابق وہ مقصود اور تقاضے کو اپنے اپنے مقام پر رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اور الحمدللہ دونوں حضرات کے لٹریچر کو کافی غور وخوض سے پڑھتے رہتے ہیں۔ جہاں تک اوّل الذکر فکر کا تعلق ہے، اس کے متعلق ہمارے اکابر مرحومین اور موجود حضرات نے

بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اصل فکر کے تعلق سے صرف دو حضرات، مولانا منظور نعمانی اور مولانا سیّد ابوالحسن ندوی، نے لکھا ہے۔ اپنے اکابر کی، اس ردّ میں جتنی کتابیں زیرِ مطالعہ ہیں، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ثانی الذکر کی تعبیر سے متفق ہیں بلکہ ثانی الذکر کی ''تعبیر کی غلطی'' کا ذہن ہی ہمارے ناقص خیال کے مطابق ان میں کام کر رہا ہے، یہ بات الگ ہے کہ ثانی الذکر کے دیگر معاملات مسائل وغیرہ میں ہمارے اکابر کا ان سے اختلاف ہے، لیکن دِین کی تعبیر کی حد تک ہمارے اکابر ان سے متفق نظر آرہے جیسا کہ جناب کی تصنیفِ لطیف تکملة فتح الملهم کی یہ عبارت بھی اس پر دال ہے: ''ولکن بعض المسلمين الذين قاموا بالردّ على العلمانية في عصرنا قد أفرطوا في ذلك الخ''۔ (تکملة فتح الملهم ج:۳ ص:۲۷۰)

لیکن معاملہ حل طلب یہ ہے کہ ثانی الذکر نے اپنی فکر کو اپنی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' یا ''الرسالہ'' وغیرہ میں جس مدلل انداز میں پیش کیا ہے، کیا اُسے مکمل صحیح اور دُرست فکر قرار دیا جاسکتا ہے یا افراط میں مبتلا شخص کو دیکھ کر خود یہ صاحب تفریط میں مبتلا ہوگئے ہیں؟ ہم اپنے مطالعے کی حد تک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایک ان میں سے اگر اِفراط کا شکار ہے تو دُوسرا یقیناً تفریط میں مبتلا ہے، لیکن پریشان کن معاملہ یہ ہے کہ ان دو فکروں کے درمیان راہِ اِعتدال گم ہے جو تلاشِ بسیار کے باوجود نظر نہیں آرہا ہے، کافی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن تشنہ لبی باقی ہے، اور آخر کار تسکینِ خاطر کے لئے جناب کی خدمت میں باہم مشورے سے یہ رُقعہ ارسال کیا جارہا ہے۔

حال ہی میں ایک کتاب ''دِین کا متوازی تصوّرِ عبادت اور خلافت کی جامعیت'' مصنفہ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی زید مجدہٗ بہت آب وتاب خاص طور پر اپنے اکابر کی تقریظ اور تاثرات کے ساتھ شائع ہوئی تھی، بہت شوق سے اس کو منگایا، بے تابی سے اس کو پڑھا، لیکن راہِ اِعتدال تاہنوز گم ہے۔ بہت سے اہلِ علم سے گفتگو ہوئی، باہمی مذاکرہ بھی ہوتا رہتا ہے، لیکن اُلجھن اپنی جگہ باقی ہے۔

ممکن ہے کہ ہم اپنا مدعا واضح کرنے میں ان مختصر اَلفاظ میں اچھی طرح کامیاب نہ ہوئے ہوں، لیکن جناب جیسے صاحبِ علم سے اُمید قوی ہے کہ مدعا سمجھ گئے ہوں گے، مکرّر عرض ہے کہ ثانی الذکر کے دُوسرے دعاوِی سے اگرچہ اختلاف ہے، لیکن دِین کی ان کی بیان کردہ تعبیر سے ہمارا بلکہ اسلام کا کہاں تک اختلاف ہے؟ اور کہاں تک اتفاق؟ اور ان دو نظریوں کے درمیان راہِ اِعتدال کیا ہے؟ اس کی وضاحت ہم جناب کی ذاتِ اقدس سے جناب کے حکمت ریز قلم سے ہی چاہتے ہیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ دو فکر اور ان کی ردّ وتصدیق میں جتنی کتابیں شائع ہوکر ہمارے علم میں آچکی ہیں، ان کا مطالعہ ہم کرچکے ہیں لیکن تشفی نہیں ہوئی۔ جناب کو معلوم ہی ہوگا کہ ان دو مختلف متضاد

فکروں کا اثر عوام میں کہاں تک پہنچ چکا ہے اور اِعتدال کی راہ کی اگر آج نشاندہی ہوسکی تو آگے شاید کسی ایک کو غلبہ حاصل ہوگا جیسا کہ ثانی الذکر کے اِمکانات ہیں تو پھر یہ غالب نظریہ اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ چھا جائے گا اور راہِ اِعتدال پر پھر ایسے دبیز پردے پڑیں گے، ان کے ہٹانے والے کو (جو یقیناً خدا کی طرف سے آئے گا) کافی مشکلات کا سامنا ہوگا۔

فقط والسلام

مظفر حسین القاسمی

خادم التدریس والافتاء

دارالعلوم رودھوان، کپواڑہ کشمیر

جواب:- مکرمی جناب مولانا مظفر حسین قاسمی صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، سفروں کی وجہ سے جو تاخیر ہوئی اس پر معذرت خواہ ہوں۔ میں نے وحیدالدین خان صاحب کی کتاب ’’تعبیر کی غلطی‘‘ پوری نہیں پڑھی، البتہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہم کی کتاب پوری پڑھی ہے، اور احقر کی رائے میں صحیح صورتِ حال وہ ہے جو احقر نے اپنی کتاب ’’حکیم الاُمتؒ کے سیاسی افکار‘‘ میں بیان کی ہے، اور اس کا خلاصہ تکملہ فتح الملہم میں بھی آیا ہے۔ یعنی سیاست و اِقتدار، دِین کا اصل مقصد نہیں[1] بلکہ مقصد کے حصول کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، اور دِین کے اِجتماعی اَحکام کی تنفیذ کے لئے اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار ہے، مگر دِین کے اصل مطمحِ نظر ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک ذریعہ اور دِین کا ایک اہم شعبہ ہونے کی حیثیت سے۔ یہی راہِ اعتدال ہے جو قرآن وسنت کے متعلقہ اَحکام سے واضح ہوتی ہے، اگر کوئی شخص اس کو مقصدِ دِین سمجھے تو وہ غلوّ کا شکار ہے، اور اگر کوئی اس کی تردید میں اس کے دِین کا حصہ ہونے ہی سے انکار کردے تو یہ بھی غلط اور دُوسری جانب کا غلوّ ہے۔

والسلام

۱۴۲۰/۱/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۴۸/۳۵۷)

---

(۱) وفی سورۃ الذّاریات: ’’وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ‘‘۔

وفی تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۵۰ (طبع مکتبہ حقانیہ) ......وقال علی رضی اللہ عنہ أی وما خلقت الجن والانس الّا لأمرهم بالعبادة واعتمد الزّجاج علیٰ هذا القول ویدلّ علیه قوله تعالیٰ ’’وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا‘‘ (التوبة: ۳۱) ...... الّا لیعرفونی الثعلبی، وهذا قول حسن لأنّه لو لم یخلقهم لما عرف وجوده وتوحیدهٗ ...... والعبادة الطاعة والتعبد التنسّک فمعنیٰ (لِيَعْبُدُوْنِ) لیذلوا ویخضعوا ویعبدوا۔

وفی تفسیر الکشاف ج:۴ ص:۴۰۸ (طبع قدیمی کتب خانه) (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ .... الآية) ای وما خلقت الجن والانس الّا لأجل العبادة ولم أرد من جمیعهم الّا ایاها۔

وفی تفسیر ابن کثیر ج:۴ ص:۲۳۸ (طبع قدیمی کتب خانه) (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) ای انّما خلقتهم لامرهم بعبادتی لا لاحتیاجی الیهم ......الخ۔

وفی التفسیر المنیر ج:۱۴ ص:۵۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئته) أی ما خلقت الثقلین الانس والجن الّا للعبادة ولمعرفتی لا لاحتیاجی الیهم ......الخ۔

۱:- ’’مغربی جمہوریت‘‘ کی شرعی حیثیت
۲:- عہدہ از خود طلب کرنا جائز نہیں
۳:- اکثریت کو فیصلوں کی بنیاد بنانے کا حکم

سوال:- میری اور اس ملک کے سب مکینوں کی زندگی کا ایک مشترک مسئلہ ہے ’’انتخاب یا جمہوریت‘‘ جس کو اسلامی رسائل اور کتب بلکہ عام درس و وعظ میں بھی ’’دورِ حاضر کا ایک عظیم بت‘‘ قرار دیا جاچکا ہے۔ دریافت طلب اُمور یہ ہیں کہ:-

۱:- کیا واقعی یہ بات صحیح ہے کہ موجودہ طرزِ انتخاب (مغربی جمہوریت) دورِ حاضر کا عظیم بت ہے؟

۲:- اگر یہ بات دُرست ہے تو جو لوگ یہاں سجدہ ریز ہیں ان کے لئے شرعی حکم کتاب و سنت میں کیا ہے؟

۳:- جو شخص وقت کی مجبوری کی آڑ میں یہاں جبہہ فرسائی اسلام کا اہم کام بلکہ عین اسلام قرار دے تو اس کے لئے قرآن و سنت کی روشنی میں کیا حکم ہے؟

مسئلے کا دُوسرا رُخ:-

۱:- اگر فی الحقیقۃ مغربی جمہوریت کو دورِ حاضر کا عظیم بت کہنا دُرست نہیں ہے، تو ایسا کہنے والوں کے لئے اسلام میں کیا حکم ہے؟

۲:- جو لوگ اِنتخاب میں حصہ لینے کے لئے خود اُمیدواری کی درخواست دیں گے اور خود اپنی تشہیر حصولِ اِقتدار کی کریں گے، وہ اپنے قول و فعل سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کہ ’’انا واللہ ما نولی علیٰ ھذا العمل أحد اسأله ولا أحد أحرص علیه‘‘ اور آپ کا حکم: ’’لا تسئل الامارة‘‘ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے یا نہیں؟

۳:- جو لوگ قانونی طور پر حق اور ناحق کی پہچان کے لئے اکثریت کے فیصلے کو وقتی طور پر معیار قبول کرلیں کیا وہ ’’اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ‘‘ جیسی قرآن مجید کی صاف اور صریح تعلیم کے خلاف کرنے کے مرتکب ہوں گے یا نہیں؟

قرآن و سنت کے مطابق مکمل اور مدلل جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

السائل: عبدالکریم
جامع مسجد (العنائیہ) جناح
اسٹریٹ گجرات
۱۴؍مئی ۱۹۹۰ء

جواب:- درحقیقت آپ کے سوالات کا مدلل اور مفصل جواب ایک مستقل کتاب کی وسعت چاہتا ہے، جس کا ایک مختصر خط میں احاطہ مشکل ہے، تاہم مختصراً سوالات کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- مغربی جمہوریت جس کی بنیاد ''عوام کی حکمرانی'' کے تصوّر پر ہے، اسلام کے قطعی خلاف ہے، کیونکہ اسلام کی بنیاد ''اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ'' کے عقیدے پر ہے، جسے قرآنِ کریم نے: ''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ''[۱] کے مختصر جملے میں ارشاد فرمایا ہے۔ لہٰذا مغربی جمہوریت کو اپنے تمام تصوّرات کے ساتھ برحق سمجھنا عہدِ حاضر کی بدترین گمراہیوں میں سے ہے، اور ایسے لوگوں کو شرعی طور پر گمراہ کہا جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص اس تفصیل کے ساتھ مغربی جمہوریت کو برحق سمجھے کہ پارلیمنٹ اگر کوئی قانون قرآنِ کریم کے کسی صریح حکم کے خلاف نافذ کردے تو (معاذ اللہ) پارلیمنٹ کا قانون ہی برحق ہوگا، تو ایسا اعتقاد کفر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلوں کو قرآن وسنت کے تابع قرار دے تو اُس کو کفر یا گمراہی نہیں کہہ سکتے، مگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مغربی جمہوریت کو جوں کا توں قبول نہیں کرتا۔

۲:- عام اسلامی حکم یہی ہے کہ ازخود کسی سرکاری عہدے یا منصب کو اپنے لئے طلب کرنا جائز نہیں،[۲] اور ایسا شخص مطلوبہ منصب کا اہل نہیں ہوتا،[۳] لیکن بعض استثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص خود اس منصب کو طلب نہیں کرے گا تو نااہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کرکے لوگوں پر ظلم کریں گے، تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا: ''اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ''[۴] کہنا اسی صورت پر محمول ہے۔ اس شرعی اُصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے موجودہ انتخابات کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے کہ طلبِ اقتدار کی بنیاد پر پورا نظامِ حکومت قائم کرنا اصلاً جائز نہیں ہے، اور اگر منشاء صرف طلبِ اقتدار ہو، یا دُوسرے اہل لوگ موجود ہوں، یا کسی اور طریقے سے غلط نظام کو بدلنا ممکن ہو تو ایسے نظامِ انتخابات میں اُمیدوار بننا جائز نہیں۔ لیکن اگر موجودہ غلط نظام کو بدلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، تو صالح اور اہل افراد اگر طلبِ اقتدار کے جذبے کے بجائے اصلاحِ حال کی غرض سے اس میں شامل ہوں تو اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مفاسد سب وشتم، غیبت اور دُوسرے محرّمات ومنکرات سے مکمل پرہیز کا اہتمام ہو، جو اس دور میں شاذ ونادر ہے۔

---

(۱) سورۃ یوسف آیت:۴۰۔

(۲ و ۳) وفی صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب من سأل الامارۃ وکل الیھا ج:۲ ص:۱۰۵۸ (طبع قدیمی)
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "لا تسئل الامارۃ فان اعطیتھا عن مسئلہ وکلت الیھا، وان اعطیتھا من غیر مسئلۃ اعنت علیھا.

وکذا فی صحیح مسلم، باب النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا. ج:۲ ص:۱۲۰ (طبع قدیمی).

(۴) سورۃ یوسف آیت:۵۵.

۳:- اکثریت کے فیصلے کو منصوص شرعی معاملات کے تصفیے کے لئے معیار بنانا گمراہی ہے، بلکہ جیسا کہ نمبر۱ میں گزرا، بعض حالات میں کفر ہے، لیکن اگر اِنتظامی معاملات میں مباحات کی حد تک، یا مجتہد فیہ اُمور میں کسی ایک جانب کی ترجیح کے لئے اگر اکثریت کو بنیاد بنایا جارہا ہے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ[۱] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے جانشین کی نامزدگی مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کی بنیاد پر کرنے کا حکم دیا۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲/۱/۱۴۱۲ھ

سیاست میں دِین اور ملک وملت کے مفاد کی حامل جماعت کی حمایت کی جائے

سوال:- موجودہ ملکی حالات میں بھٹو کا ساتھ دینا کفر کا ساتھ دینے اور اپوزیشن کا ساتھ دینا اسلام کا ساتھ دینے کے مترادف ہے، یہ آواز مسجدوں اور اکثر علماء کی طرف سے سنائی دے رہی ہے، اس کے بارے میں راہنمائی فرمائی جائے۔

جواب:- شریعت کا حکم تو اتنا ہے کہ نیکی وتقویٰ میں تعاون کیا جائے اور فسق وفجور اور اِثم و عدوان میں تعاون نہ کیا جائے،[۲] نیز سیاست میں اس شخص یا جماعت کی حمایت کی جائے جس کی حمایت میں دِین اور ملک وملت کا مفاد زیادہ ہو، اب یہ واقعات اور بصیرت ورائے کا مسئلہ ہے کہ کس کی جماعت میں ملک وملت کا مفاد دِینی اعتبار سے زیادہ ہے، یہ دارالافتاء سے پوچھنے کی بات نہیں، بلکہ اپنے ضمیر اور اپنی بصیرت کے مطابق ہر شخص کو اس کا فیصلہ خود کرنا چاہئے، مفتی کا منصب شخصیات سے بحث کرنا نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۶/۶/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۲/ ۲۸ ج)

برما میں تمام مسلمانوں یا مخصوص مسلم قبائل کے لئے جدوجہد کرنے والی دو جماعتوں میں سے کس کی حمایت کی جائے؟

سوال:- برما میں مظلوم مسلمانوں کی دادرسی اور حصولِ آزادی کے لئے برمیز مسلم آرگنائزیشن (B.M.O) اور روہنگیا پیٹریوٹک فرنٹ (R.P.F) یعنی ''محبِ رُوہنگیا محاذ'' نامی دو

(۱) سیرۃ عمر بن الخطاب ص: ۵۰۹ مصنفہ: علی محمّد محمّد الصَّلابی.
(۲) لقولہ تعالیٰ: ''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' الآیة، سورة المائدة: ۲.

جماعتیں کام کر رہی ہیں، اوّل الذکر برما کے تمام مسلمانوں کو شامل کر کے اسلام کے نام پر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) جدوجہد کر رہی ہے، جبکہ مؤخر الذکر برما میں مسلمانوں کے متعدّد قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ''روہنگیا'' قبیلے یا قومیت کے نام پر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) جدوجہد کر رہی ہے، ہمیں بتائیں کہ شرعی اعتبار سے ہم کس کی حمایت کریں؟

جواب:- جو جماعت اسلام کا نام ہی نہ لیتی ہو بلکہ واقعۃً اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتی ہو، اس کے ساتھ تعاون علی التقویٰ کیا جائے، اور جو جماعت قبائلی عصبیت کی دعوت دیتی ہو اس کے ساتھ تعاون دُرست نہیں،(۱) البتہ اگر قبائلی عصبیت کی داعی نہ ہو،(۲) لیکن اس نے اپنی جدوجہد کا دائرہ کسی خاص خطے یا قبیلے کے ساتھ محدود کر رکھا ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، اور مسلمان اس کے ساتھ بھی تعاون علی التقویٰ کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۸/۲۸ ج)

اِنتخابات میں کسی اُمیدوار کے بارے میں ''فلاں کو ووٹ دے کر ہم اللہ کے اِحتساب سے بچ سکتے ہیں'' کے الفاظ کا حکم

سوال:- بعض اِشتہاروں میں جو اِنتخابات کے سلسلے میں جاری ہو چکے ہیں، یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ: ''فلاں اُمیدوار کو ووٹ دے کر ہم روزِ محشر اللہ تعالیٰ کے اِحتساب سے بچ سکتے ہیں'' اور اس کا مقصد یہ ہے کہ نیک اور اچھے آدمی کو ووٹ دینے سے آخرت میں غلط ووٹ کی جواب دہی اور اِحتساب سے آدمی بچ سکتا ہے۔

اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں نبوّت کا دعویٰ ہے۔ آپ کا ان الفاظ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب:- مذکورہ مقصد کے تحت یہ الفاظ لکھنے سے نبوّت کا دعویٰ لازم نہیں آتا، اور اگر مقصد وہی ہے جو سوال میں لکھا گیا ہے اور جس آدمی کے حق میں یہ جملہ لکھا گیا ہے، وہ لکھنے والے کے نزدیک واقعۃً حلقے کے دُوسرے تمام اُمیدواروں سے زیادہ نیک اور اہل ہے، تو ان الفاظ کے لکھنے میں

---

(۱) لقوله تعالى: ''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' الآية، سورة المائدة: ۲.

(۲) في سنن النسائي ج: ۲ ص: ۱۷۴ و ۱۷۵ (طبع مكتبه الحسن لاهور) ''عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات مات ميتة جاهلية ..... ومن قاتل تحت راية عمية يدعوا الى عصبية أو يغضب لعصبية فقتل فقتلةٌ جاهلية.'' رقم الحديث: ۴۰۲۵.

شرعاً کوئی حرج نہیں، البتہ کسی شخص کے بارے میں جزم اور وثوق کے ساتھ اتنا بڑا دعویٰ کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۴۰۳/۱۲/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۲۴/۲۲۰)

چہرے کے پردے کی شرعی حیثیت اور خاتون اُمیدوار کا اِنتخابی پوسٹروں میں فوٹو شائع کرنے کا حکم

سوال ۱:- قومی اتحاد کے جلسوں میں بیگم نسیم ولی خان اور بیگم صفیہ شکیل اسٹیج کی زینت بنتی ہیں، اخبارات میں اُن کا فوٹو چھپتا ہے، لوگ اخباروں میں ان کی تصویریں دیکھ لیتے ہیں اور تقریریں بھی پڑھتے ہیں، سنا ہے کہ غیرمحرم عورت کی تصویر دیکھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اُس کو دیکھنا، غیرمحرم عورت کی آواز بھی پردہ ہے، اگر ایسی اُونچی آواز سے تلاوتِ قرآن پاک بھی کرے جس کو کوئی غیرمحرم مرد سنے تو بھی گناہ ہے۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

۲:- یہ ٹھیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا رشتہ دار سے پردہ کرایا ہے؟

۳:- حضرت خالد بن ولیدؓ کی اہلیہ محترمہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپی مبارک میدانِ جہاد میں دے کر واپس ہونے لگیں تو انہوں نے فرمایا: اے سوار! تم نے مجھ پر بڑا اِحسانِ عظیم کیا، اپنا نام بتا، اُس وقت پتہ چلا کہ یہ میری بیوی ہے، گویا چہرے کے پردے کا بھی اتنا اہتمام تھا کہ خاوند کو پتہ نہ لگا کہ میری بیوی ہے؟

۴:- مفتی محمود، بھٹو صاحب کو اِقتدار پر لائے تھے، اور جن لوگوں نے اِن کی مخالفت کی تھی مفتی محمود صاحب نے اُن کی مخالفت کی تھی، اب جو مفتی محمود صاحب کے لگائے ہوئے پودے کو کاٹنا نہیں چاہتے اُن کی مفتی محمود صاحب مخالفت کرتے ہیں، اب بھٹو صاحب کی تائید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵:- جو شخص جمہور اہلِ سنت والجماعت کے سلف صالحین پر تنقید کرے، اس شخص کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب ۱ تا ۳:- عورت پر پردے کا وجوب ایک اِجماعی اور غیرمختلف فیہ مسئلہ ہے، اور یہ پردہ چہرے کا بھی ہے،(۱) اور اس کا فوٹو شائع کرنا بھی شرعاً جائز نہیں، ان مسائل میں کسی عالمِ دِین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور اس کے خلاف کسی کا عمل شریعت میں حجت نہیں۔

---

(۱) وفي الدّر المختار، كتاب الصلوة ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع سعيد) وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين رجال لا لأنّه عورة بل لخوف الفتنة.

۴:- اشخاص و ذوات سے متعلق سوالات فتویٰ سے متعلق نہیں۔

۵:- اس مسئلے پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مفصل فتویٰ ''جواہر الفقہ'' میں شائع ہو چکا ہے، اسے ملاحظہ فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۸/۳/۱۳۹۷ھ

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۲۱/۳/۱۳۹۷ھ

(اِنتخابات میں قرآنی آیات واحادیث کو مخالف اُمیدواروں پر چسپاں کرنے کی مختلف صورتوں کا حکم)

۱:- ''وَکَانَ فِی الْمَدِیْنَۃِ تِسْعَۃُ رَھْطٍ'' الآیۃ میں ۹ مفسدوں کو قومی اِتحاد کے ۹ لیڈروں پر چسپاں کرنا

۲:- قرآنِ کریم کے لفظ ''ھَلْ'' کو سیاسی جماعت کے انتخابی نشان پر چسپاں کرنا

۳:- تلاعب بالقرآن کی مختلف صورتیں اور ایسی مجالس میں شرکت کا حکم

سوال:- گزشتہ انتخابی مہم کے دوران جس طرح سے مخالف جماعتوں نے ایک دُوسرے کے خلاف جائز و ناجائز طوفان برپا کیا، جناب بھی پورے طور پر واقف ہوں گے، بلکہ غلط انداز سے قرآنِ کریم اور اَحادیث شریفہ کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر ایک سیاسی پارٹی کے مقرّرین صاحبان اور اَخبار نے یہ کہا کہ: ''وَکَانَ فِی الْمَدِیْنَۃِ تِسْعَۃُ رَھْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ'' الخ، اس آیتِ کریمہ میں مفسد اَفراد کا ذکر ہے، لہٰذا قومی اِتحاد کے چونکہ ۹ لیڈر ہیں اس کی طرف اشارہ تھا۔ دُوسری پارٹی کے ایک مقرّر صاحب نے جلسۂ عام میں نو ستاروں کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے قرآنِ کریم کی آیت: ''وَبِالنَّجْمِ ھُمْ یَھْتَدُوْنَ'' اور ''رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ'' وغیرہ سے اِستدلال کیا، نیز ''ہل'' کا نشان منتخب کرنے پر فرمایا کہ ''ھَلْ'' کا ذکر قرآن میں چالیس مقام پر آیا ہے، پھر چند آیات پڑھیں جن میں لفظ ''ھَلْ'' کا استعمال ہوا ہے۔ جناب سے اِستدعا ہے کہ اس کا شرعی حکم بتائیں۔

۱:- کیا قومی اتحاد کے ۹ لیڈروں پر آیت: ''وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ'' منطبق کی جاسکتی ہے؟

۲:- اسی طرح لفظ ''هَلْ'' کا استعمال؟

۳:- کیا اپنے مقصد کے لئے قرآنی آیات کا ذکر مناسب ہے؟

۴:- کیا تلاعب بالقرآن یا تحریفِ قرآن کے زُمرے میں یہ نہیں آتا؟

۵:- ایسے مجمع میں شامل ہونے والے سامعین کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- آیتِ قرآنی: ''وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ ....الخ'' کا واقعہ بالکل دُوسرا ہے، اگر اس آیت کو موجودہ دور کی سیاسی پارٹیوں پر اس نیت سے چسپاں کیا جائے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں ہے تو یہ صریح تحریفِ قرآن ہے، اور اگر یہ مقصد ہو کہ آیت تو دُوسرے واقعے میں اُتری تھی لیکن یہاں بھی صادق آتی ہے تو یہ آیت کا غلط استعمال ہے اور سیاسی مخالفت کی بناء پر کسی شخص کو کفار کی صف میں شامل کرنا بدترین غلطی ہے۔ (۱)

۲:- ہرگز نہیں، قرآنِ کریم کے لفظ ''هَلْ'' کو انتخابی نشان پر چسپاں کرنا نری جہالت ہے، اور اگر اس نیت سے ہو کہ قرآن میں لفظ ''هَلْ'' سے مراد ہی انتخابی نشان ہے تو صریح تحریف ہے۔ (۲)

۳:- ہرگز صحیح نہیں، قرآنِ کریم کی آیات کو اس طرح سیاسی یا انتخابی جنگ میں استعمال کرنا جس سے عوام میں غلط تأثر ہو، انتہائی بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔ (۳)

۴:- ایسی باتوں کے بارے میں قوی خطرہ ہے کہ وہ تلاعب بالقرآن میں داخل ہوں، جو لوگ ایسا کریں وہ سخت غلطی کے مرتکب ہیں، البتہ اُنہیں کسی بُرے لقب سے پکارنے کے بجائے انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔ (۴)

۵:- ایسی مجلسوں میں جہاں قرآنی آیات کو اس طرح غلط استعمال کیا جاتا ہو، شرکت نہ کرنا

---

(۱) فی الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ ''وکذا قولھم بکفرہ اذا قرأ القران فی معرض کلام الناس، کما اذا اجتمعوا فقرأ فجمعناھم جمعًا، وکذا وکاسًا دھاقًا، عند رویة کأسٍ. رقم:۱۴۸.

قال فی شرحه: ذکر فی القاموس أن معنی قول الزهری لا تناظروا بکتاب الله ولا بکلام رسوله لا تجعلوا شیئًا نظیرًا لهما، معناه لا تجعلوهما مثلًا لشیء یعرضه به کقول القائل جئت علٰی قدر یا موسٰی لمسمّٰی بموسٰی جاء فی وقت مطلوب.

(۲) حوالہ سابقہ۔

(۳) حوالہ سابقہ۔

(۴) قال الله تعالیٰ فی القران الکریم: ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ....'' الآیة:۱۲۵ (سورة النّحل) ''وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللهُ اِلَیْکَ ....'' الآیة (سورة القصص:۷۷).

چاہئے، اور شرکت ہو جائے تو ایسا کرنے والوں کو اُن کی غلطی پر متنبہ کرنا چاہئے۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۷ھ

مرد اُمیدوار کی موجودگی میں عورت کو ''ووٹ'' دینے کا حکم

سوال:- مرد اُمیدوار کی موجودگی میں جو بہتر نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اُسے ووٹ دینا اسلام کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- مرد اُمیدواروں کی موجودگی میں جو بہتر نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اُسے ووٹ دینا شرعاً جائز نہیں۔ (۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۷/۲۸ ج)

پاکستان سے اِلحاق کرنے والے ریاست کے ایک حکمران کو معاہدے کے تحت دی گئی مراعات واپس لینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین ومفتیانِ شرعِ متین اس صورتِ حال کے بارے میں کہ ایک ریاست ''الف'' جو کہ اَز رُوئے قانون آزادیٔ ہند مجریہ ۱۹۴۷ء ۱۴؍اگست سلطنتِ برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوگئی اور اس کا حکمران بموجب قانون اس اَمر کا حق دار ہوگیا کہ وہ آزاد مملکت ہندوستان یا نوزائیدہ مملکت پاکستان میں سے کسی ایک میں شمولیت اختیار کرلے یا آزاد رہے۔ چنانچہ ریاست ''الف'' کے حکمران نے مطابق دستاویزِ شمولیت (جس کا اُردو ترجمہ منسلک ہے) پاکستان میں محض جذبۂ اِسلامی وجذباتِ دِینی وملّی کی بناء پر شمولیت اختیار کرلی، جس کے نتیجے میں حکمرانِ مذکور اور اس کے اہلِ خاندان کو ہندوستان کے حملے اور ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا، اور اپنی ریاست اور جملہ املاک و جائیداد سے محروم ہونا پڑا، دستاویزِ شمولیت کے مطابق شق نمبر ۱ میں حکمران مذکور نے اپنی ریاست کا الحاق پاکستان میں کرنے کا عہد کیا ہے، اور اسے پاکستانی مقنّنہ اور سپریم کورٹ کا پابند کیا ہے، بشرطیکہ دستاویز

(۱) فی الشامیة ج:۶ ص:۳۴۸ (طبع سعید) لو دعی الیٰ دعوة فالواجب الاجابة ان لم یکن هناک معصیة ولا بدعة والامتناع أسلم فی زماننا اِلّا اذا علم یقینا أن لا بدعة ولا معصیة اھ.

(۲) فی صحیح البخاری، کتاب المغازی، کتاب النبی صلی الله علیه وسلم إلی کسریٰ وقیصر، رقم:۴۰۷۳ ج:۲ ص:۶۷۳ (طبع قدیمی کتب خانه) "..... لما بلغ رسول الله صلی الله علیه وسلم أن أهل فارس قد ملکوا علیهم بنت کسریٰ قال: لن یفلح قوم ولّوا أمرهم امرأة". نیز دیکھئے کفایت المفتی، کتاب السیاسیات ج:۹ ص:۳۴۹ (طبع جدید دارالاشاعت)۔

میں دی گئی شرائط کوملحوظ رکھا جائے۔

شق نمبر۶ و ۷ میں آئندہ بنائے جانے والے قوانین و آئین کے ذریعے کوئی تبدیلی یک طرفہ نوعیت کی جس کی منظوری حکمرانِ مذکور سے حاصل نہ کرلی جائے عمل میں نہ لائی جائے۔

اس شمولیت کے تحت حکومتِ پاکستان کی جانب سے تحفظات و مراعات خصوصی نوعیت کی حکمرانِ مذکور کو حاصل تھیں اور جو ۴۷-۹-۲۴ سے رائج تھیں، مگر سابقہ حکومت نے حکمرانِ مذکور کی منظوری کے بغیر یک طرفہ طور پر ان تمام مراعات اور تحفظات کو سلب کرلیا اور حکمرانِ مذکور کو ان سے محروم کردیا۔

۱:- اَز رُوئے شریعتِ محمدی اور قرآن و سنت اسلامی حکومت پاکستان کا یہ یک طرفہ قدم جو کہ دستاویز شمولیت کی صریح خلاف ورزی ہے، کیا شرع اور دِینی اِعتبار سے اس کا کوئی جواز ہے؟ اور کیا اَز رُوئے فقہِ اسلامی یہ یک طرفہ تبدیلیٔ معاہدہ جائز ہے یا ناجائز؟

۲:- اگر یہ فعل ناجائز ہے تو کیا ایسی کوئی حکومت جو کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی مدعی اور علی الاعلان دعوے دار ہو سابقہ حکومت کی اس پالیسی اور فیصلے کی پابند ہے جو کہ اس نے دِینی اور اَخلاقی حدود سے تجاوز کرکے کیا ہو؟

۳:- کیا شرعی اعتبار سے حکمرانِ مذکور اس یک طرفہ انحرافِ معاہدہ کی بنا پر کسی ہرجانے اور تاوان کا مستحق ہے؟ اس نقصان اور اذیت کے بدلے میں جو اس بنا پر اُسے اور اس کے اہلِ خاندان کو پہنچا ہو؟

چنانچہ گزارش ہے کہ مذکورہ بالا اُمور میں فتویٰ و فیصلہ قرآن و سنت اور اَحادیثِ نبوی کی روشنی میں صادر فرمایا جائے۔

از طرف

غلام معین الدین

تنقیح

اِستفتاء کے ساتھ معاہدے کی دستاویز منسلک نہیں ہے، جواب اس دستاویز کے مطالعے پر موقوف ہے، اس لئے اس اِستفتاء کے ساتھ معاہدے کی دستاویز اِرسال کی جائے تو اصل سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے۔

محمد تقی عثمانی

جوابِ تنقیح

سوال کے ساتھ دستاویز منسلک ہے۔

جواب:- حکومتِ پاکستان کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ وہ اس معاہدے کی پابندی کرے،[۱] جو کسی ریاست کے اِلحاق کے وقت والیٔ ریاست سے کیا، لیکن منسلکہ دستاویز شمولیت میں والیٔ ریاست کے لئے کسی قسم کی خصوصی مراعات وتحفظات کا ذکر نہیں، البتہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور قانونِ آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء میں جن کا ذکر دستاویز شمولیت کی دفعہ نمبر ۱ و ۲ میں ہے، والیٔ ریاست کو کچھ خصوصی مراعات وتحفظات دیئے گئے ہوں تو ان مراعات وتحفظات کی پابندی حکومتِ پاکستان پر اس وقت تک لازم ہے جب تک ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ باقی ہے، اور اگر مذکورہ دو قوانین میں بھی کوئی مراعات وتحفظات موجود نہیں ہیں یا معاہدے کے بعد کسی اور دستاویز کے ذریعے طے پائے ہیں تو ان کی تبدیلی سے معاہدۂ شمولیت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، اس صورت میں اس دُوسری دستاویز کو دیکھ کر ہی اس کا شرعی حکم بتایا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۰/۴/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۴/۳۱ ب)

سرکاری ملازمتوں اور املاک واراضی میں ترجیح کی بنیاد علاقائی وجغرافیائی عصبیت ہے یا اہلیت؟

سوال:- مکرمی ومحترمی جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، واضح ہو کہ مندرجہ ذیل مسئلے پر اپنی علمی رائے اور دلائل سے مطلع فرماویں، ممنون ہوں گا، مطلوبہ جواب فتویٰ تصوّر نہ ہوگا۔

۱:- قرآن مجید، سنتِ نبوی وخلفائے راشدین یا فقہائے عظام کے اِرشادات کی روشنی میں ایک اسلامی مملکت کے مختلف علاقوں (صوبوں) کے باشندوں کو، دُوسرے علاقوں کے باشندوں کے حق برائے حصول صوبہ جاتی سرکاری ملازمت، املاک واراضی میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے یا مختلف علاقوں کے باشندوں کے ان حقوق کو اس خاص علاقے کے باشندوں تک محدود رکھا گیا ہے؟

۲:- کیا اگر ایک اسلامی مملکت میں ایک علاقے کے باشندوں کو دُوسرے علاقوں میں معاشی حقِ اِنتفاع کے سلسلے میں ایسا یکساں اِستحقاق نہ دیا جائے تو یہ شرعاً دُرست ہوگا؟

۳:- کیا اسلامی نظریۂ عدل کی رُو سے ایسے یکساں معاشی اِستحقاق کی پالیسی بنانا اسلامی حکومت کے لئے شرعاً ضروری اور لازمی ہے؟

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" وفی سورۃ المائدۃ: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" الآیۃ.

۴:- جب ایک اسلامی مملکت میں حقوق کے تحفظ کے نام پر علاقائی قومی عصبیت پیدا کی جارہی ہوتو اس وقت اس عصبیت کو روکنے کے لئے مختلف علاقوں (صوبوں) کے درمیان معاشی تحفظ کی وہ کونسی منصفانہ حکمتِ عملی بنانی چاہئے جو اسلامی نظریۂ عدل کے بھی مطابق ہو اور اِسلامی مملکت کی وحدت اور اِستحکام کے لئے بھی مفید ہو؟

اُمید ہے کہ آنجناب اس اہم مسئلے پر ہماری راہنمائی فرمائیں گے،شکریہ۔آپ کی ذاتی رائے مطلوب ہے نہ کہ دارالافتاء کا فتویٰ۔

والسلام

خاکسار عبدالخالق سہریانی بلوچ

ایم اے ایل ایل بی

جواب:- محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، آپ نے سرکاری ملازمتوں اور املاک و اراضی میں جغرافیائی اور علاقائی مساوات کے بارے میں جو سوال کیا ہے، اس کا جواب احقر کی رائے میں یہ ہے کہ اسلام نے کسی بھی منصب یا ملازمت کے سلسلے میں بنیادی طور پر یہ اصول پیشِ نظر رکھا ہے کہ جس شخص کا تقرّر مقصود ہو اس میں اس منصب کی پوری اہلیت پائی جانی ضروری ہے، اور جو شخص جس منصب کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو، وہ اس منصب کا زیادہ اہل ہے، خواہ جغرافیائی اعتبار سے اس کا تعلق کسی خطے سے ہو،[1] لہٰذا اس معاملے میں ترجیح کی بنیاد اہلیت ہے، نہ کہ جغرافیائی تعصّبات،[2] یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومتوں میں ایک خطے کے باشندوں کو بلاتکلف دُوسرے خِطوں میں متعین کیا جاتا رہا ہے۔

لہٰذا یہ بات تو شریعت میں کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی کہ جس شخص میں کسی منصب کی اہلیت نہ ہو، اس کو محض اس لئے کسی منصب پر فائز کردیا جائے کہ وہ کسی خاص علاقے کا باشندہ ہے،[3] البتہ اگر مختلف خِطوں کے لوگ اہلیت کے اعتبار سے مساوی ہوں تو اس صورت میں انتظامی سہولت کی خاطر یہ اُصول مقرّر کرنا جائز ہے کہ ہر علاقے میں اسی علاقے کے اہل اَفراد کو ترجیح دی جائے، کیونکہ وہ اس علاقے کے مسائل اور لوگوں کی نفسیات سے بھی زیادہ واقف ہوگا، اور اس علاقے کے لوگ اس سے مانوس بھی زیادہ ہوں گے۔

اسی طرح اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ کسی علاقے کے لوگ باہر کے کسی عہدہ دار کو دِل سے قبول نہیں کریں گے اور اس سے ملک وملت میں انتشار پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہوجائے تو اس صورت

(۱ تا ۳) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر ''معارف القرآن'' ج:۲ ص:۴۴۹ (طبع ادارۃ المعارف کراچی)۔

میں اس بات کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے کہ ملت کو اِنتشار سے بچانے کے لئے کسی ایسے شخص کا تقرّر کردیا جائے جو فی نفسہٖ اہل تو ہو، لیکن دُوسرے علاقے کے لوگوں میں اس سے زیادہ اہلیت رکھنے والے موجود ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا کہ حکمران قریش ہی میں سے ہوں گے،(۱) اس کی حکمت علامہ ابنِ خلدونؒ نے یہی بیان فرمائی ہے کہ اہلِ عرب کا قریش کے سوا کسی اور پر جمع ہونا مشکل تھا۔(۲)

لیکن اس بات کی شرعاً ہرگز گنجائش نہیں کہ لوگوں کے متعصّبانہ خیالات کی وجہ سے نااہل افراد کو ذمہ دارانہ منصب حوالے کردیئے جائیں،(۳) ایسی صورت میں لوگوں کی خواہشات کے اِتباع کے بجائے ان کے خیالات کی اِصلاح ضروری ہے۔(۴)

اُمید ہے کہ اس تفصیل سے آپ کے تمام سوالات کا جواب ہوگیا ہوگا، اگر پھر بھی کوئی اُلجھن باقی ہو تو دوبارہ ارشاد فرماویں، اِن شاء اللہ اپنی بساط کے مطابق جواب عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

والسلام

۱۴۰۵/۷/۱ھ

---

(۱) وفی صحیح البخاری کتاب الأحکام ج:۲ ص:۱۰۵۷ (طبع قدیمی کتب خانہ) باب الأمراء من قریش ..... سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول أن ھذا الأمر فی قریش لا یعادیھم أحدٌ الّا کبّہ اللہ علیٰ وجھہ ما أقاموا الدین. وفیہ أیضًا عن ابن عمر رضی اللہ عنھما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یزال الأمر فی قریش ما بقی منھم اثنان .....الخ. وکذا فی صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۱۹ (طبع سعید).

وفی مصنف ابن ابی شیبۃ رقم الحدیث:۳۳۰۵۵ ج:۱۷ ص:۲۸۵، ۲۸۶ (طبع ادارۃ القرآن کراتشی) عن أنس رضی اللہ عنہ قال: أتانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن فی بیت رجل من الأنصار فأخذ بعضادتی الباب ثم قال: ''الأئمۃ من قریش.''

(۲) وفی تاریخ ابن خلدون، الفصل السادس والعشرون فی اختلاف الاُمّۃ فی حکم ھذا المنصب وشروطہ ج:۱ ص:۲۰۶ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) ولنتکلم الآن فی حکمۃ اشتراط النسب لیتحقق بہ الصّواب فی ھذہ المذاھب فنقول ان الأحکام الشرعیۃ کلھا لا بدّ لھا من مقاصد وحکم تشتمل علیھا ...... وذٰلک ان قریشًا کانوا عصبۃ مضر وأصلھم وأھل الغلب منھم وکان لھم علیٰ سائر مضر العزّۃ بالکثرۃ والعصبیۃ والشرف فکان سائر العرب یعترف لھم بذٰلک ویستکینون لغلبھم فلو جعل الأمر فی سواھم لتوقع افتراق الکلمۃ بمخالفتھم وعدم انقیادھم ولا یقدر غیرھم من قبائل مضر أن یردّھم عن الخلاف ولا یحملھم علی الکرّۃ فتفترق الجماعۃ وتختلف الکلمۃ والشارع محذّر من ذٰلک حریصٌ علیٰ اتفاقھم ورفع التنازع والشتات بینھم لتحصل اللحمۃ والعصبیۃ وتحسن الحمایۃ بخلاف ما اذا کان الأمر فی قریش لأنھم قادرون علیٰ سوق الناس بعصا الغلب الیٰ ما یراد منھم فلا یخشیٰ من أحد خلاف علیھم ولا فرقۃ لأنھم کفیلون حینئذٍ بدفعھا ومنع الناس منھا فاشترط نسبھم القرشی فی ھٰذا المنصب وھم أھل العصبیۃ القویۃ لیکون أبلغ فی انتظام الملّۃ واتفاق الکلمۃ .....الخ.

(۳) وفی صحیح البخاری کتاب العلم ج:۱ ص:۱۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) اذا وسد الأمر الیٰ غیر أھلہ فانتظر الساعۃ. وفیہ أیضًا کتاب الرّقاق ج:۲ ص:۹۶۱ (طبع قدیمی) اذا أسند الأمر الیٰ غیر أھلہٖ فانتظر الساعۃ.

وراجع للتفصیل الیٰ شرحہ فی فتح الباری ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع قدیمی کتب خانہ) وعمدۃ القاری ج:۲ ص:۳ (طبع مکتبہ رشیدیہ).

(۴) وفی التفسیر الکبیر تحت آیۃ رقم:۵۸ من سورۃ النّساء: ویدخل فیہ عدل الأمراء مع رعیتھم وعدل العلماء مع العوام بان لا یحملوھم علی التعصّبات الباطلۃ بل یرشدونھم الیٰ اعتقادات وأعمال تنفعھم فی دنیاھم وأُخراھم.

کسی سیاست دان کا اِنتخابات کے موقع پر سیاسی جماعت سے کیے ہوئے وعدے کو توڑنے کا حکم

سوال:- حالیہ اِنتخابات کے نتیجے میں رحیم یارخان میں چند کونسلروں نے اپنا ایک گروپ تشکیل دیا، جس میں فلاں فلاں کونسلر شریکِ اجلاس ہوئے، اور تمام گروپ کے کونسلروں نے بالاتفاق حلفاً خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کیا کہ ہم آئندہ اِنتخاب میں بلدیہ رحیم یارخان کا چیئرمین چودھری عبدالحمید گاندھی کو اور وائس چیئرمین ہارون باجوا کو بنائیں گے، لیکن چند روز کے بعد دُوسرا حلف قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کرلیا کہ ہم سب میاں عبدالخالق گروپ میں ہیں اور جس کو میاں عبدالخالق جہاں چاہیں استعمال کریں، لیکن پھر اس کے علاوہ اخبارات اور دُوسرے ذریعے سے یہی اعلان کیا جاتا رہا کہ ہمارا نامزد چیئرمین عبدالحمید گاندھی ہے، لیکن آخری دن جبکہ چیئرمین کا اِنتخاب تھا تو دانستہ ان ممبران نے عبدالخالق کو چیئرمین کا ووٹ دیا، اور عبدالحمید گاندھی کو نظرانداز کیا گیا، جبکہ عبدالحمید گاندھی نے ان ممبران سے کہا کہ تم نے میری چیئرمینی کے لئے حلف دیا ہے، تو اَب مجھ کو چیئرمین بناؤ تو اس پر ممبران نے کہا کہ یہ سیاسی حلف تھا اور ہم نے تمہارا ووٹ صرف اس لئے استعمال کیا کہ ہمیں مزدور اور خاتون کی نشست مل جائے، اب وہ نشستیں ہم نے حاصل کرلیں، اب تمہاری ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ اِنتخابات کے ایام ہی میں ان میں سے بعض ممبران نے عوام سے مسجدوں میں بیٹھ کر یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم کامیابی کے بعد اپنا ووٹ عبدالخالق کو نہ دیں گے، لیکن ان لوگوں کے اس واضح متضاد عمل اور حلف شکنی اور جان بوجھ کر قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر وعدہ خلافی سے جو دِینی اقدار پامال ہوئے اور لوگ اب قرآن پر حلف اُٹھانے کو مزاح سمجھنے لگ گئے ہیں، اس کے لئے علمائے دِین ومفتیانِ کرام فتویٰ صادر فرماویں کہ اگر ان کا یہ عمل دانستہ اور جان بوجھ کر تھا تو شریعتِ مطہرہ کی رُو سے ایسے لوگوں کا کیا مقام ہے؟ ایک اسلامی معاشرے میں یہ لوگ عوام کے نمائندہ بن سکتے ہیں؟ (مرزا محمد رفیق)

جواب:- پہلا معاہدہ تحریری صورت میں ہوا تھا، اس تحریر کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں حلف یا قسم نہیں تھی، البتہ ایک عہد تھا، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اس عہد میں شامل افراد کے لئے اس عہد کی خلاف ورزی بلاعذر جائز نہیں تھی،[۱] البتہ اگر اس عہد کے بعد ان کو دیانت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو منتخب کرنے کا عہد کیا گیا ہے، دُوسرا اس کے مقابلے میں بہتر ہے، تو اس عذر کی وجہ سے ان کے لئے جائز تھا کہ اس عہد کو منسوخ کر کے اس شخص کو منتخب کرتے جو ان کے نزدیک زیادہ بہتر تھا۔ صورتِ

(۱) فی القرآن الکریم: "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" سورۃ الاسراء آیۃ: ۳۴.

مسئولہ میں اگر ان لوگوں نے اس قسم کے صحیح عذر کے بغیر عہد شکنی کی تو سخت گناہگار ہوئے اور ایسے لوگ نمائندگی کے اہل نہیں، اور اگر فیصلے کی تبدیلی کسی عذر کی بناء پر تھی تب بھی آخر وقت تک اپنے دِلی اِرادے کے خلاف اعلان کرتے رہنا جھوٹ ہے، اور وہ بھی سخت گناہ ہے، لہٰذا جو لوگ اس جھوٹ کے مرتکب ہوئے وہ بھی سخت گناہگار ہوئے،(۱) اور ایسے لوگ بھی نمائندگی کے اہل نہیں تاوقتیکہ وہ اپنے ان گناہوں سے صدقِ دِل کے ساتھ توبہ نہ کریں۔(۲) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

جماعتِ اسلامی، جمہوریت اور جمعیت علمائے اسلام کے بارے میں ایک سوال کا جواب

سوال:- ''تحریکِ جمہوریت'' کے نام سے جو جماعت معرضِ وجود میں آئی ہے، جماعتِ اسلامی بھی جس کی حامی ہے، آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر مودودی صاحب اسلامی نظام کی آڑ لے کر اس ملک کو امریکا کی گود میں ڈالنا چاہتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ جماعتِ اسلامی کا یہ موقف کیا دُرست ہے کہ جمہوریت کی بحالی دراصل اسلامی نظام لانے کی کوشش کا ذریعہ ہے، جس طرح پاکستان حاصل کرنے کا ذریعہ جداگانہ اِنتخاب ہی تھا۔

۲:- دُوسرا مسئلہ جو آج کل ملک میں بڑی شد و مد کے ساتھ پھیلایا جارہا ہے اور شد و مد کے ساتھ مخالفت بھی کی جارہی ہے، وہ ہے ''سوشلزم'' اس نظام کی داعی نیشنل عوامی پارٹی ہے، لیکن تائید میں جمعیت علمائے اسلام کے بعض ذمے دار حضرات بھی بیان دے رہے ہیں، جماعتِ اسلامی اس کی مخالفت میں پیش پیش ہے، جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے سوشلزم کا نعرہ کیونکر دُرست اور مطابق عین اسلام ہوگا؟ جمعیت علمائے اسلام اس سلسلے میں جو کچھ کر رہی ہے اس میں آنجناب اور دیگر علماء کس حیثیت سے شامل ہیں؟

جواب:- جہاں تک جماعتِ اسلامی میں شمولیت و عدم شمولیت کا تعلق ہے، اس کا جواب اس مطبوعہ ورق میں موجود ہے، جو آپ کو پہلے اِرسال کیا جاچکا ہے۔

رہی تحریکِ جمہوریت کی بات! سو جب متحدہ حزبِ اختلاف نے یہ مہم شروع کی تھی تو حسین شہید سہروردی مرحوم نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کو اس تحریک میں شامل ہونے کی

(۱ و ۲) قال الله تعالىٰ: ''إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا'' الآية:۵۸ سورة النساء.

فى صحيح مسلم ج:۲ ص:۳۲۶ (طبع قديمى كتب خانه) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''عليكم بالصدق! فان الصدق يهدى الى البر وان البر يهدى الى الجنّة .... واياكم والكذب! فان الكذب يهدى الى الفجور وان الفجور يهدى الى النّار ....'' الحديث: ۱۲۷۴.

دعوت دی تھی، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ: ''ہمارا اصل مطالبہ اسلامی نظام کا قیام ہونا چاہئے، پھر اگر اسلام میں کسی درجے کے اندر جمہوریت ہے تو وہ خود بخود اس مطالبے کے اندر آجائے گی، لیکن نری جمہوریت کی تحریک میں شمولیت سے معذور ہوں۔'' اس جملے سے آپ تحریکِ جمہوریت کے بارے میں ان کے موقف کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

اب سوشلزم کی بات رہ جاتی ہے، تو اس میں کوئی ایسا مسلمان جو اِسلام اور اِشتراکیت سے واقف ہو، شک نہیں کرسکتا کہ سوشلزم اسلام کے یکسر منافی نظام ہے، اِسلام اپنا الگ معاشی نظام رکھتا ہے جو سرمایہ داری اور اِشتراکیت دونوں سے مختلف ہے، جو شخص اسلام کے بارے میں تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہو وہ سوشلزم کو اِسلام کے مطابق نہیں کہہ سکتا۔ موجودہ جمعیت علمائے اسلام کا بھی کوئی ایسا بیان ہمارے علم میں نہیں ہے جس میں اُس نے سوشلزم کی حمایت کی ہو۔ بلکہ اِس الزام کی بعض تردیدیں نظر سے گزری ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ موجودہ جمعیت علمائے اسلام وہ جمعیت نہیں ہے جس نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کی تھی اور جس کی بنیاد علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، اس جمعیت کا مارشل لاء کے بعد احیاء نہیں کیا گیا، موجودہ جمعیت علمائے اسلام ایک دُوسری جماعت ہے جو قیامِ پاکستان کے بہت بعد قائم ہوئی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم اس جماعت کے کبھی رُکن نہیں رہے، اور نہ اس کی پالیسی میں حضرت مدظلہم کے مشوروں کا کوئی دخل ہے، لہٰذا اس کے کسی قول و فعل کی ذمہ داری اُن پر عائد نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

***

کتاب الدّعویٰ والشھادات والقضاء

(دعویٰ، گواہی اور فیصلوں کے مسائل کا بیان)

قانون ''میعادِ سماعت'' کی شرعی حیثیت

(قانون ''میعادِ سماعت'' کی حقیقت، تاریخ، شرعی تصوّر، دلائل، پچھلے زمانوں میں اس کی موجودگی، اور اس قانون کی حکمت پر مفصل فتویٰ)

سوال:- بعض جدید ترقی یافتہ ممالک میں "Limitation Act" کے نام سے جو اُصول وقوانین رائج و نافذ ہیں، ان کی تاریخ کیا ہے؟ اور کیا وہ سراسر غیر اسلامی اُصول ہیں؟ اگر یہ اُصول وقوانین غیر اسلامی ہیں تو دیوانی وفوجداری مسائل و اُمور میں چارہ جوئی کی میعاد کا عدمِ تعین جو عملی خرابیاں پیدا کرتا ہے اس کا تدارک کیونکر کیا جاسکتا ہے خصوصاً اگر اس عدمِ تعین کو کاٹ کے "Categonical Imperatin" کی حیثیت دی جائے تو جائیداد غیر منقولہ کے برسوں پُرانے معاملات متأثر ہوتے ہیں، اگر یہ اُصول وقوانین غیر اسلامی نہیں تو ان کے اسلامی ہونے کا کیا جواز ہے جبکہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں شفعہ چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے؟

اگر عنقریب قومی اتحاد برسرِ اقتدار آجائے تو پورا کا پورا اسلام کیونکر نافذ ہوگا اور "Limitation Act" کو کس طرح مشرف بہ اسلام کیا جائے گا؟ یا پھر اُسے کس بناء پر ایک کلمہ گو قانون کی حیثیت حاصل ہوگی؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں، آمین۔

گرامی نامہ باعثِ مسرّت و افتخار ہوا، آپ کے سوال کے بارے میں عرض یہ ہے کہ قانونِ میعادِ سماعت (Limitation Act) سراسر غیر اسلامی قانون نہیں ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ''اسلام کی تاریخ میں شفعہ کو چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عدالتیں بھی میعادِ سماعت کا لحاظ کرتی رہی ہیں، خاص طور سے ترکی خلافت کے دور میں عالمِ اسلام کے تمام قاضی خلیفۂ وقت کی مقرّر کردہ میعادِ سماعت پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اور فقہائے اسلام نے اُن کے اس عمل کی نہ صرف توثیق وتائید کی ہے بلکہ خلیفۂ وقت کے منشور کے جاری ہونے کے بعد اس کو واجب العمل قرار دیا ہے۔ ''الاشباہ والنظائر'' کے مشہور شارح علامہ حمویؒ نے اپنے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانے کے سلاطین نے تمام قاضیوں کو یہ حکم دیا ہوا ہے کہ وہ وقف اور وراثت کے سوا کوئی

دعویٰ بناءِ دعویٰ قائم ہونے کے پندرہ سال بعد قابلِ سماعت نہ سمجھیں، اور فتاویٰ حامدیہ میں (جس کی تنقیح علامہ ابنِ عابدین شامیؒ نے کی ہے) اس مسئلے پر چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کے فقہاء کے فتاویٰ نقل کئے ہیں جو اس بات پر یک زبان ہیں کہ سلطان کی طرف سے اس ممانعت کے اجراء کے بعد پندرہ سال بعد کوئی مقدمہ داخل نہ کیا جائے۔[1] البتہ علامہ خیرالدین رملیؒ نے فتاویٰ خیریہ میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ اس بارے میں ہر خلیفہ کی طرف سے ازسرِنو حکم جاری ہونا میعادِ سماعت کی پابندی کے لئے ضروری ہے۔

البتہ مختلف زمانوں میں مختلف میعادیں مقرّر کی گئی ہیں، فقہِ حنفی کی کتابوں میں بعض مقدمات کے پندرہ سال، بعض کے لئے تینتیس سال اور بعض کے لئے چھتیس سال کی مدتیں مقرّر کی گئی ہیں، مثلاً درمختار میں ہے:[2] ''القضاء مظهر لا مثبت ويتخصص بزمان ومكان وخصومة حتّٰى لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوىٰ بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ينفذ، قلت: فلا تسمع الآن بعدها الا بأمر.''

اس کے تحت علامہ شامیؒ نے اس مسئلے پر کافی مفصل بحث کی ہے، اور اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ: ''قال المتأخرون من أهل الفتوىٰ: لا تسمع الدعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة الّا أن يكون المدعى غائبًا أو صبيًا ....الخ.''[3]

بلکہ علامہ شامیؒ نے شمس الائمہ سرخسیؒ کی مبسوط سے نقل کیا ہے کہ: ''اذا ترک الدعوىٰ ثلاثًا وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوىٰ ثم ادّعى لا تسمع دعواه.'' (ردّ المحتار، كتاب القضاء مطلب فى عدم سماع الدعوىٰ بعد خمس عشرة سنة ج:۲ ص:۳۴۴، مطبوعه ديوبند)۔[4]

(۱و۲) ج:۵ ص:۴۱۹ (طبع سعید) نیز دیکھئے حاشیہ نمبر۴۔

(۳) رد المحتار ج:۵ ۴۲۲ (طبع سعيد).

(۴) كتاب القضاء ج:۵ ص:۴۲۲ (طبع سعيد).

وفى الفتاوىٰ تنقيح الحامدية، كتابُ الدّعوىٰ ج:۲ ص:۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه) وقال المتأخرون من أهل الفتوىٰ لا تسمع الدّعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة الّا أن يكون المدعى غائبًا أو صبيًّا أو مجنونًا أو المدعى عليه أميرًا جائرًا يخاف منه كذا فى الفتاوىٰ العتابيه.

وقال فى البحر عن المبسوط ترک الدّعوىٰ ثلاثًا وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدّعوىٰ ثم ادعىٰ لا تسمع دعواه لأنّ ترک الدّعوىٰ مع التمكن يدلّ علىٰ عدم الحق ظاهرًا .... والحاصل من هٰذه النقول أن الدّعوىٰ بعد مضى ثلاثين سنة أو بعد ثلاثة وثلاثين لا تسمع اذا كان التّرک بلا عذرٍ من الأعذار المارة لأن تركها هٰذه المدّة مع التمكن يدلّ علىٰ عدم الحق ظاهرًا ....الخ.

وفى الفتاوىٰ الكاملية كتاب الدّعوىٰ ص:۱۱۳.

وفى مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر فصل قضاء المرأة فى غير حد وقود ج:۲ ص:۸۸ لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوىٰ بعد خمس عشرة سنة يجب عليه عدم سماعها ولو سمعها وقضى لا ينفذ لأنّه لا يصير قاضيًا بالنّسبة الىٰ تلك الحادثة كما فى المنح.

.............................(باقی اگلے صفحے پر)

شمس الائمہ سرخسیؒ خلافتِ عباسیہ کے دور کے ہیں، جس سے واضح ہوا کہ میعادِ سماعت کا یہ تصوّر خلافتِ عباسیہ میں بھی موجود تھا، افسوس ہے کہ میں اس وقت پاؤں کے ایک زخم کی وجہ سے صاحبِ فراش اور چلنے سے معذور ہوں، اس لئے دُوسری کتابوں کی مراجعت اس وقت ممکن نہیں، ورنہ اس پر شاید اور بھی قدیم حوالے دستیاب ہوجاتے، تاہم صرف علامہ شامیؒ کی مذکورہ تصریحات سے بھی اتنا واضح ہوجاتا ہے کہ میعادِ سماعت کا تصوّر نہ صرف غیر اسلامی نہیں، بلکہ اسلامی عدالتیں ہر دور میں اس پر کسی نہ کسی شکل میں عمل پیرا رہی ہیں۔

البتہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے، اور شاید آپ کو بھی یہی شبہ ہوا ہو کہ محض تأخیر کی بنا پر ایک صاحبِ حق کو حق سے محروم کرنے کا کیا جواز ہے؟

موجودہ قوانین میں اس سوال کا جواب نصفت (Equity) کے ان مقولوں کے ذریعے دیا گیا ہے کہ:-

"The Law aids the diligent and not the indolent."

قانون چوکس لوگوں کی مدد کرتا ہے، غافلوں کی نہیں۔

"Ther Should be an end to Litigation"

عدالتی مخاصموں کی کوئی انتہا ہونی چاہئے۔

لیکن یہ مقولے موجودہ قوانین کے حق میں اس لئے پورے اطمینان بخش نہیں ہوتے کہ وہاں دیانت اور قضاء کی کوئی تعریف کم از کم عملاً نہیں ہے، بلکہ جو حق عدالت سے مسترد ہوگیا، عملاً وہ حق ہی نہیں رہا۔ اس کے بجائے اسلامی فقہ میں دیانت اور قضاء کے اَحکام ساتھ ساتھ چلتے ہیں لہٰذا اگر عدالت نے کسی حق کا تصفیہ کرنے سے انکار کردیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حق نہیں رہا، بلکہ وہ حق موجود ہے اور جس کے ذمے حق ہے اُس پر دیانۃً فرض ہے کہ وہ اُسے صاحبِ حق تک پہنچائے، خواہ کتنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وفی الفتاوی الأنقرویة ج:۲ ص:۵۸ وفی المبسوط رجل ترک الدّعوىٰ ثلاثًا وثلاثین سنة ولم یکن لهٗ مانع من الدّعوىٰ ثم ادعىٰ لهٗ لا تسمع دعواهٗ لأنّ ترک الدّعوىٰ مع التمکن علیه یدلّ علىٰ عدم الحق ظاهرًا۔

وفی درر الحکام المادّة: ۱۶۶۰ ج:۴ ص:۲۶۱ (طبع مکتبه علمیه) اذا ادّعىٰ أحد بأنّ العقار کالدّار والکرم الّذی فی تصرّف شخصٍ آخر مدّة خمس عشرة سنة بلا نزاع بأنّه ملکه أو انّ لهٗ حصة فیه فلا تسمع دعواهٗ اهـ۔

(وکذا فی الشامیة ج:۵ ص:۴۲۲ طبع سعید)۔

وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ رقم المادّة: ۱۶۶۳ ج:۵ ص:۱۷۷ قال المتاخرون من أهل الفتوىٰ لا تسمع الدّعوىٰ بعد ست وثلاثین سنة الّا أن یکون المدعی غائبًا أو صبیًّا أو مجنونًا ولیس لهما ولی أو المدّعی علیه أمیرًا جابرًا۔

وفیها أیضًا رقم المادّة: ۱۶۷۰ ج:۵ ص:۱۸۷ اذا ترک المورث الدّعوىٰ مدّة یترکها الوارث أیضًا مدّة وبلغ مجموع المدتین حدّ مرور الزمان فلا تسمع۔

زمانہ بیت چکا ہو، اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو عدالت خواہ اُسے کچھ نہ کہے، لیکن وہ گنہگار ہوگا، اسی لئے فقہاءؒ کا یہ مقولہ ''الاشباہ والنظائر'' وغیرہ میں درج ہے کہ: ''الحق لا یسقط بتقادم الزمان''[1] یعنی ''حق زمانہ گزر جانے کی بناء پر ساقط نہیں ہوتا'' اس سے مراد یہی ہے کہ میعادِ سماعت گزر جانے کے باوجود وہ حق موجود ہے جس کا ایک اثر تو اُخروی ہے کہ اس حق کو تلف کرنے والا گنہگار ہے، دُوسرا اثر دُنیوی ہے کہ جس شخص کو بھی اس حق تلفی کا یقینی علم ہوگا وہ اس پر فاسق کے اَحکام جاری کرے گا، جس سے اس کے ساتھ اس کے سارے معاملات متاثر ہوں گے، تیسرا اثر یہ ہے کہ اگرچہ عدالت اس مسئلے کو سننے سے انکار کرچکی، لیکن اگر خلیفہ کے پاس اپیل پہنچے اور وہ محسوس کرے کہ مقدمہ جان دار ہے اور اس میں چال بازی بظاہر نہیں ہے تو فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ وہ اسے کسی قاضی کے پاس بھیج سکتا ہے، اس صورت میں قاضی اس کی سماعت کرے گا (شامی ج:۴ ص:۳۴۳)[2]۔

نیز ایسی صورت میں صاحبِ حق قاضی کو ثالث بنا کر بھی فیصلہ کراسکتا ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ صرف زبانی طور پر نہیں بلکہ عملاً بھی میعادِ سماعت سے حق ساقط

---

(۱) وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۴۲۰ (طبع سعید) قد استفید من کلام الشارح أن عدم سماع الدّعویٰ بعد ہٰذہ المدّة انّما ہو للنہی عنہ من السلطان فیکون القاضی معزولًا عن سماعہا لما علمت من ان القضاء یتخصص فلذا قال الّا بأمر أی فاذا أمر بسماعہا بعد ہٰذہ المدّة تسمع وسبب النہی قطع الحیل والتزویر فلا ینافی ما فی الاشباہ وغیرہا من أن الحق لا یسقط بتقادم الزمان ولذا قال فی الاشباہ أیضًا ویجب علیہ سماعہا أی یجب علی السلطان الّذی نہیٰ قضاتہ عن سماع الدّعویٰ بعد ہٰذہ المدّة أن یسمعہا بنفسہ أو یأمر بسماعہا کی لا یضیع حق المدّعی والظّاہر أن ہٰذا حیث لم یظہر من المدّعی امارة التزویر .....الخ.

وفی شرح المجلّة رقم المادّة: ۱۶۷۴ ص: ۹۹۶ لا یسقط الحق بتقادم الزّمان فاذا أقرّ المدعیٰ علیہ واعترف صراحة فی حضور الحاکم بأن حق المدعی عندہ فی الحال علی الوجہ الّذی یدعیہ وکان قد مرّ الزّمان علی الدّعویٰ فلا یعتبر مرور الزّمان ویحکم بموجب اقرار المدعیٰ علیہ.

وفی تکملة حاشیة ردّ المحتار ج:۱ ص:۳۳۲ ثم اعلم ان عدم سماعہا لیس مبنیًّا علیٰ بطلان الحق حتّی یرد أن ہٰذا قول مہجور لأنّہ لیس ذٰلک حکمًا ببطلان الحق، وانّما ہو امتناع عن القضاة عن سماعہا خوفًا من التّزویر ولدلالة الحال کما دل علیہ التّعلیل والّا فقد قالوا ان الحق لا یسقط بالتقادم کما فی قضاء الاشباہ فلا تسمع الدّعویٰ فی ہٰذہ المسائل مع بقاء حقّ للآخرة ولذا لو أقرّ بہ یلزمہ کما فی مسئلة عدم سماع الدّعویٰ بعد مضی خمس عشرة سنة اذا نہی السلطان عن سماعہا کما تقدّم قبیل باب التحکیم فاغتنم .....الخ.

وفی تکملة حاشیة ردّ المحتار ج:۷ ص:۴۸۷ (طبع سعید) ثم اعلم أن عدم سماع الدّعویٰ بعد مضی ثلاثین سنة أو بعد الاطلاع علی التّصرف لیس مبنیًّا علیٰ بطلان الحق ذٰلک وانّما ہو مجرّد منع للقضاة عن سماع الدّعویٰ مع بقاء الحق لصاحبہٖ حتّی لو أقرّ بہ الخصم یلزمہ ولو کان ذٰلک حکمًا ببطلانہ لم یلزمہٗ ویدلّ علیٰ ما قلناہُ تعلیلہم للمنع بقطع التّزویر والحیل کما مرّ فلا یرد ما فی قضاء الاشباہ من أن الحق لا یسقط بتقادم الزّمان ثم رأیت التصریح بما نقلناہُ فی البحر قبیل فصل دفع الدّعویٰ ......الخ.

(۲) وفی رد المحتار ج:۵ ص:۴۲۰ یجب علی السلطان الذی نہیٰ قضاتہ عن سماع الدعویٰ بعد ہٰذہ المدة ان یسمعہا بنفسہ أو یأمر بسماعہا کی لا یضیع حق المدعی والظاہر ان ہٰذا حیث لم یظہر من المدعی امارة التزویر ...الخ.

نہیں ہوتا، میعادِ سماعت مقرّر کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مدّتِ دراز گزرنے کے بعد بھی اگر حقِ سماعت باقی رکھا جائے تو اس سے ایک طرف تو مقدمات میں مکر وفریب اور جھوٹی گواہیوں کا امکان بڑھ جائے گا، کیونکہ مدّتِ دراز گزرنے کے بعد واقعے کے عینی گواہ ملنے مشکل ہوتے ہیں، اور مل بھی جائیں تو واقعے کی پوری تفصیلات ذہن میں نہیں رہتیں، اس لئے اس قسم کے مقدمات عدالتوں میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مقدمات میں غیرضروری تعویق ہو اور لاینحل مسائل کھڑے ہوجائیں، میعادِ سماعت کی یہی حکمت ہمارے فقہاء نے بھی بیان فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی فقہ میں اس کی بنیاد موجود ہے، اور جب کبھی شریعت کی بنیاد پر موجودہ قوانین کی تدوینِ نو کی جائے گی تو اس قانون کو بالکلیہ مسترد یا منسوخ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس پر مذکورہ فقہی بنیادوں پر نظرِ ثانی کی جائے گی، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قانون میں اتنی ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی جتنی دُوسرے بہت سے قوانین میں ضرورت پیش آئے گی۔ (۱)

والسلام

۲۳؍رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۸۷/ ۲۸ ج)

مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے بھی دعوے میں جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات کہنا جائز نہیں

سوال:- جنابِ محترم!

دُوسرا اِستفتاء مذکورہ مسجد کے متعلق کچھ اس طرح مطلوب ہے، چونکہ علاقے کے کچھ لوگ اس کو مسجد ہی تسلیم نہیں کرتے، ان کا موقف یہ ہے کہ اس علاقے میں مسجد کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس پلاٹ پر لائبریری یا اسی قسم کا کوئی سینٹر وغیرہ علاوہ مسجد کے قائم ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں حضرات نے اپنا اثر ورُسوخ استعمال کرکے مسجدِ ھٰذا منہدم کرانے کا حکم جاری کرادیا، اس صورتِ حال کے پیشِ

(۱) ''قانون میعادِ سماعت'' سے متعلق مزید اہم تفصیلات کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''عدالتی فیصلے'' ج:۲ ص:۲۱۹ تا ص:۲۳۶ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کا ایک اہم فیصلہ بعنوان ''غاصبانہ قبضہ اور حقِ ملکیت'' ملاحظہ فرمائیں۔

نظر اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اس معاملے کو عدالت میں پیش کیا جائے، اور فوری طور سے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکمِ امتناعی عدالت سے لے لیا جائے، چنانچہ مسجد کمیٹی کے ایک عہدے دار نے ایک وکیل صاحب سے مل کر تمام حالات بتائے اور انہیں متعلقہ تمام کاغذات دِکھائے، وکیل صاحب نے اطمینان دِلایا کہ ان شاء اللہ مسجد منہدم نہیں ہوگی۔ عدالت سے میں کوشش کر کے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکم جاری کراؤں گا۔ پھر انہوں نے کئی صفحات پر مشتمل ایک دعویٰ نامہ تیار کر کے اسے ٹائپ کروایا، اس تحریری دعوے کو عدالت میں داخل کرنے سے قبل مسجد کمیٹی کے ایک عہدے دار سے دستخط کروائے اور خود وکیل صاحب نے بھی اس پر دستخط کئے۔

مذکورہ عہدے دار کے دستخط کرنے کے بعد وکیل صاحب نے بتایا کہ میں نے اس تحریر میں ایک پوائنٹ یہ بھی دِکھایا ہے کہ اس پلاٹ پر جس پر اب مسجد قائم ہے اس پر علاقے کے لوگ گزشتہ کئی سالوں سے نمازیں ادا کر رہے ہیں، جبکہ حقیقۃً ایسا نہیں، لیکن اِستفسار پر وکیل صاحب نے کہا کہ مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے میں نے ایک قانونی اور عدالتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ پوائنٹ رکھا ہے۔ الحمدللہ وکیل صاحب بھی مسلمان اور پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں، اور پھر وکیل صاحب نے مزید وضاحت کی کہ ہمارے اس بیان سے قائم شدہ مسجد اِن شاء اللہ اُمید قوی ہے کہ عدالت کی جانب سے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکمِ امتناعی جاری کر دیا جائے گا۔ انہوں نے مزید تقویت دِلائی کہ ہمارے اس بیان سے کسی کو ذاتی نقصان پہنچانا یا کسی کا حق مارنا مقصود نہیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ کے گھر کو شہید ہونے سے بچانا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ ہماری نیت کو جانتا ہے۔

چونکہ حکامِ بالا کی جانب سے مسجد کو منہدم کرنے کا حکم جاری ہو چکا تھا، ان کا عملہ کسی بھی وقت آ کر اسے منہدم کر سکتا تھا، اب صرف یہی صورت تھی کہ عدالت کا حکم ہی انہیں اس کو منہدم کرنے سے روک سکتا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہوئے مسجد کمیٹی کے یہ عہدے دار خاموش رہے اور وکیل صاحب نے عدالت میں کاغذات داخل کر دیئے، عدالت نے حکمِ امتناعی جاری کرنے سے انکار کر دیا اور ہمارا پیش کردہ مقدمہ خارج کر دیا۔ اس کے بعد مسجد کو منہدم کرنے کے لئے سرکاری عملہ موقع پر پہنچ گیا، لیکن ان پر کیا ہیبت طاری ہوئی کہ وہ مسجد کو منہدم کئے بغیر واپس چلے گئے، اور ابھی تک اللہ کے فضل سے مسجد قائم و دائم ہے، لوگ باجماعت پنج وقتہ نمازیں ادا کر رہے ہیں۔

جواب :- دعوے میں جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات کہنا ہرگز جائز نہیں تھا۔ اس ناجائز کام پر صدقِ دِل سے توبہ ضروری ہے، مسجد کی ہر قیمت پر تعمیر فرض نہیں، جھوٹ سے بچنا فرض ہے۔(۱)

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۹/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۹۶/۳۹ و)

حضرت ولید بن عقبہؓ کے واقعۂ حد میں خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ پر ایک اِشکال کا جواب

سوال :- بخدمتِ اقدس مخدومی المعظم اُستاذی المحترم زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ جنابِ والا بخیر و عافیت ہوں گے، دُعا ہے اللہ تعالیٰ جناب کے سایہ کو دائم قائم

(۱) وفی الآیۃ: "ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ" (آل عمران: ۶۱).

وفی مشکوٰۃ المصابیح ج:۱ ص:۱۷ کتاب الایمان، باب الکبائر وعلامات النفاق الفصل الأوّل (طبع قدیمی کتب خانہ) عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ: آیۃ المنافق ثلاث، زاد مسلم: وان صام وصلّٰی وزعم انّہ مسلم ثم اتفقا: اذا حدّث کذب واذا وعد أخلف واذا اُوتمن خان. (متفق علیہ).

وفی مشکوٰۃ المصابیح ج:۲ ص:۴۱۲ (طبع قدیمی) ایاکم والکذب وانّ الکذب یھدی الی الفجور وانّ الفجور یھدی الی النّار، وما یزال الرّجل یکذب ویتحرّی الکذب حتّٰی یُکتب عند اللہ کذّابًا. (متفق علیہ).

وفی مشکوٰۃ المصابیح کتاب الامارۃ والقضاء باب الأقضیۃ والشھادات، الفصل الأوّل (طبع قدیمی)

عن أمّ سلمۃ رضی اللہ عنھا أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: انّما أنا بشر وانکم تختصمون الیّ ولعلّ بعضکم ان یکون ألحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علیٰ نحو ما أسمع منہُ فمن قضیت لہ بشیء من حق أخیہ لا یأخذنہ فانّما أقطع لہ قطعۃ من النار. (متفق علیہ).

وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۴۲۷ (طبع سعید) الکذب مباح لاحیاء حقہ ودفع الظّلم عن نفسہ والمراد التعریض لأنّ عین الکذب حرام قال وھو الحق قال تعالیٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ"

وفی الشامیۃ والضابط فیہ کما فی تبیین المحارم وغیرہ عن الأحیاء ان کل مقصود محمود یمکن التوصل الیہ بالصدق والکذب جمیعًا فالکذب فیہ حرام. وفیھا أیضًا بعد أسطر قال علیہ الصلاۃ والسلام: کل کذب مکتوب لا محالۃ الّا ثلاثۃ الرجل مع امرأتہٖ أو ولدہ والرّجل یصلح بین اثنین والحرب فانّ الحرب خدعۃ. قال الطحاوی وغیرہ وھو محمول علی المعاریض لأنّ عین الکذب حرام قلت وھو الحق قال تعالیٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ" وقال علیہ الصلاۃ والسلام: الکذب مع الفجور وھما فی النار، ولم یتعیّن عین الکذب للنّجاۃ وتحصیل المرام .....الخ.

وفی الدّر المختار أیضًا بعدہ ج:۶ ص:۴۲۸ (طبع سعید) وللصلح جاز الکذب أو دفع ظالم .....الخ.

وفی خلاصۃ الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۴۶ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) یجوز الکذب فی ثلاثۃ مواضع فی الصلح بین النّاس وفی الحرب، ومع امرأتہ ....الخ.

وفی سکب الأنھر کتاب الکراھیۃ فصل فی المتفرقات ج:۲ ص:۵۵۲ (طبع داراحیاء التراث العربی بیروت) والکذب حرام الّا فی الحرب للخدعۃ وفی الصلح بین اثنین وارضاء الأھل، وفی دفع الظّالم عن الظّلم والمراد التعریض لأنّ عین الکذب حرام، قال فی المجتبیٰ وھو الحق قال تعالیٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ".

فرمائے آمین۔ آپ سے اس دور کے اندر اللہ تعالیٰ نے دِین کی حفاظت کا جو کام لیا ہے اور لے رہے ہیں، اس کی مثال ملنا مشکل ہے، یہ پوری اُمت پر آپ کا احسان ہے، مشکل سے مشکل مسئلے کا حل آپ کی کتب میں ملتا ہے، بہت دِل خوش ہوتا ہے، اللّٰھم زد فزد، آمین۔

اس وقت حدِ شربِ خمر کی بحث میرے زیرِ مطالعہ ہے، جنابِ والا کی عظیم تالیف ''تکملہ'' سے بہت رہنمائی ملی ہے، اس وقت ایک ذہنی اُلجھن پیدا ہوگئی ہے، جس کو حل کرانے کے لئے خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ساتھ نادم بھی ہوں کہ آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ جنابِ والا کو اَجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔

میری پریشانی یہ ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پروَرِش میں رہ چکے ہیں، ان کے کردار سے واقف ہیں، جب کوفہ کے حاکم بنائے گئے تو ان کے خلاف سازش تیار کی گئی کہ انہوں نے شراب پی ہے، اور وہی سازشی لوگ شراب پینے کی شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ولید بن عقبہؓ کے خلاف دیتے ہیں، اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ولیدؓ کو طلب کر کے اس شہادت کے حوالے سے ان سے جواب طلبی کرتے ہیں، اور وہ جواب دیتے ہیں کہ ''فواللہ انھما لخصمان موتوران'' لیکن اس جواب کو پذیرائی نہیں بخشی گئی اور ان پر حد جاری کی گئی۔

اس پر میرا شبہ ہے جو یقیناً غلط ہوگا، لیکن اپنی غلطی مجھ پر واضح نہیں ہے، اس لئے جناب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

شبہ یہ ہے کہ جب مدعا علیہ گواہان کو مجروح اور جرح بھی خصوصاً مجرد نہ ہو بلکہ وجہ بھی بیان کرے کہ گواہان ان کے سخت دُشمن ہیں، تو پھر اِنصاف کا تقاضا یہ ہے کہ صفائی کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ان کی دُشمنی کو ثابت کرے، خصوصاً حدود کے اندر احتیاط بہت ضروری ہے جو شبہات سے ٹل جاتی ہے۔

فقہاء نے بھی عدالتی طریقۂ کار میں ملزم کو صفائی کا موقع دینے کا ذکر کیا ہے۔

حضرتِ والا نے تکملہ فتح الملہم ج:۲ ص:۴۹۸ تا ۵۰۲ میں اس واقعے پر تفصیل سے بحث کی ہے، جنابِ والا کا یہی رُجحان ہے کہ محض شہادت کی بناء پر ان پر حد جاری ہوئی ہے، ورنہ وہ اس کردار کے آدمی نہیں تھے، اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابتداء کے اندر خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی حد جاری کرنے میں تردّد تھا، بلکہ تکملہ کے پیرا نمبر ۷ ص:۵۰۱ پر لکھا ہے کہ ''أنّ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ لم یزل یشک فی صحّة شھادة الشھود علی الولید'' اس وضاحت سے میرا شبہ مزید مضبوط ہوجاتا ہے کہ ان کو صفائی کا موقع ملنا چاہئے تھا کہ گواہان کی دُشمنی کو ثابت کرتے اور حد سے بچ جاتے،

مگر ایسا نہ ہوا۔

مجھے اس شبہ کے اظہار پر بھی تردّد لگتا ہے کہ چونکہ یہ عظیم ہستی کا فعل ہے جو یقیناً صحیح ہوگا، اور میرا شبہ کرنا غلط ہوگا، اس پر توبہ کرتا ہوں، چونکہ ایک عرصہ تک عدالتی کام سے واسطہ رہا ہے، وہاں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۲ کے تحت ملزم کو صفائی کا موقع دیا جاتا ہے، اس عادت کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا ہے، جس کا ذکر کر دیا ہے، آخر میں دُعا کی درخواست ہے۔

والسلام
جناب کا شاگرد
(قاضی) بشیر احمد عفا اللہ عنہ
باغ، آزاد کشمیر
۲۰۰۵/۳/۱۴ء

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تاریخی روایات سے اس دور کے کسی مقدمے کی مکمل کارروائی اور اس کی تفصیلات کا پورا علم نہیں ہوتا۔ راوی اپنی ترجیحات کے مطابق جو حصہ روایت کرنا مناسب سمجھتے ہیں، روایت کرتے ہیں، باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو صفائی کا موقع نہ دیا گیا ہو، قاعدے سے اگر انہوں نے گواہوں پر جرح کی تو اُس جرح کا بارِ ثبوت بھی اُن پر ہونا تھا، اور شاید وہ اسے مکمل طور پر ثابت نہ کر سکے ہوں، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ہمارے لئے ایک خلیفۂ راشد کے فیصلے کے بارے میں مطمئن ہونے کے لئے یہ احتمال بھی کافی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۶/۲/۲۱ھ

مدعا علیہ کی غیر موجودگی میں مدعی سے رقم لے کر اس کے حق میں فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

سوال:- تحصیل مولوی صاحب کے پاس کسی قسم کا تنازعہ آگیا، جناب کے پاس فیصلۂ شریعت کی درخواست کی گئی، مولوی صاحب نے مدعی اور مدعا علیہ کو بلا کر بیان لئے، بیان لے کر ہر دو فریقین کو تاریخ دے دی، تاریخ سے قبل مدعی نے جا کر مولوی صاحب کو تھوڑی رقم روپیہ دیا، اور مدعا علیہ

(۱) تفصیل کے لئے تکملۃ فتح الملہم ج:۲ ص:۴۹۸ تا ۵۰۲ ملاحظہ فرمائیں۔

کے کوئی آدمی مخاصم تھے، یعنی دُشمن مخاصمان سے شہادت لے کر عدم موجودگیٔ مدعاعلیہ کے مولوی صاحب نے مدعی کے حق میں فیصلہ لکھ دیا، مدعی نے تاریخ سے قبل مدعاعلیہ کو پڑھ کر سنایا، مدعاعلیہ نے وہ فیصلہ نہ مانا، لہٰذا علاء الدین نے آگے دوبارہ درخواست کی کہ اس مسئلے پر غور فرمائیں چونکہ یہ مسئلہ غور کے قابل ہے، عندشریعت محمدی و مذہب حنفیہ کے مولوی صاحب کا حکم یک طرفہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

(مقامی دارالافتاء کی طرف سے جواب)

الجواب: "وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ" الآية، "وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خٰلِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ"۔ [۱] دُوسری جگہ ہے: ولا تصح ولاية القاضى حتّى يجتمع فى المولّى شرائط الشهادة ويكون من أهل الاجتهاد۔ [۲] دُوسری جگہ ہے: ولو كان القاضى عدلا ففسق بأخذ الرشوة أو غيره كالزنا وشرب الخمر۔ [۳] تیسری جگہ ہے: وينبغى للمقلد أن يختار من هو الأقدر والاولىٰ لقوله عليه السلام: من قلد انسانًا عملا وفى رعيته من هو اولى منه فقد خان الله ورسوله وجماعة المسلمين، وفى حد الاجتهاد كلام عرف فى اصول الفقه حاصله أن يكون صاحب حديث له معرفة بالفقه ليعرف معانى الآثار او صاحب فقه له معرفة بالحديث لئلا يشتغل بالقياس فى المنصوص عليه. (الهداية مع الدراية ص:۱۳۲، كتاب ادب القاضى)۔ [۴]

چوتھی جگہ: قال ولا يقضى القاضى علىٰ غائب الّا ان يحضر من يقوم مقامه وقال الشافعیؒ يجوز لوجود الحجة وهى البينة فظهر الحق ولنا ان العمل بالشهادة لقطع المنازعة ولا منازعة بدون الانكار ولم يوجد، ولأنه يحتمل الاقرار والانكار من الخصم فيشتبه وجه القضاء لأنّ أحكامهما مختلفة. (الهداية مع الدراية ص:۱۴۲، كتاب ادب القاضى)۔ [۵]

والعدو لا تقبل شهادته علىٰ عدوه اذا كانت دنيوية ولو قضى القاضى بها لا ينفذ ذكره يعقوب باشا فلا يصح قضاؤهٗ عليه۔ [۶] دُوسری جگہ: اخذ القضاء برشوة للسلطان أو لقومه وهو عالم بها أو بشفاعة، جامع الفصولين وفتاوىٰ ابن نجيم أو ارتشى وهو أو أعوانه بعلمه شرنبلالية وحكم لا ينفذ حكمه. (الدر المختار كتاب القضاء ص:۳۰۶)۔ [۷]

---

(۱) سورة النساء آية:۱۴.
(۲) الهداية ج:۳ ص:۱۳۹ كتاب ادب القاضى (طبع رحمانيه).
(۳) حوالہ سابقہ۔
(۴) الهداية ج:۳ ص:۱۴۰ كتاب ادب القاضى (طبع رحمانيه).
(۵) الهداية ج:۳ ص:۱۵۰ (طبع رحمانيه).
(۶) الدر المختار ج:۵ ص:۳۵۶، ۳۵۷ (طبع سعيد).
(۷) الدر المختار ج:۵ ص:۳۶۲، ۳۶۳ (طبع سعيد).

ھٰذا مشتمل علیٰ ثلاثۃ صوَر: ۱-رشوت ستانی، ۲-شہادت دُشمن بردُشمن، ۳-عدم موجودگی مدعاعلیہ، جبکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر تین صورتوں میں سے ایک صورت قاضی کے لئے ہو تو قضاءِ قاضی منعدم کی جاتی ہے، لہٰذا تین صورتوں کا اِجراء من القاضی ہوجائے تو اس کی قضاء بطریقِ اَولیٰ نافذ نہیں ہوگی، بحوالہ ہدایہ، درمختار اور تمام کتب الفقہاء اور مع نص کے قضاء رَدّ کی جاتی ہے۔

المجیب مصیب

احقر العباد مظفر الدین عفی عنہ

(جواب از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

جواب:- جوابِ بالا دُرست ہے، صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان دُرست ہے تو تین وجوہ سے مولوی صاحب کا فیصلہ شرعاً نافذ نہیں ہے، ایک یہ کہ انہوں نے مدعاعلیہ کی عدم موجودگی میں فیصلہ کیا، وفی الدر المختار: ولا یقضی علیٰ غائب ولا له ای لا یصح بل لا ینفذ علی المفتی به بحر (الشامی ج:۴ ص:۵۲)۔[1] دُوسرے یہ کہ مدعاعلیہ کے دُشمن سے اس کے خلاف گواہی قبول کی گئی، والعدو لا تقبل شهادته علیٰ عدوه اذا کانت دنیویة ولو قضیٰ القاضی بها لا ینفذ ذکره یعقوب باشا. (درمختار مع الشامی ص:۴۶۵)۔[2] تیسرے یہ کہ رشوت لی گئی، اور اگرچہ قاضی مرتشی کے فیصلوں کے نفاذ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، لیکن جس مقدمے میں رشوت لی گئی ہو اس کے بارے میں اکثر فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ اس میں فیصلہ نافذ نہیں ہوتا، خلافاً للبعض ومال الشامی الیٰ ترجیح قول البعض لضرورة الزمان. (شامی ج:۴ ص:۴۷۱) ولا ضرورة هنا۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

۱۳۹۱/۳/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۳۷ الف)

***

---

(۱) الدر المختار ج:۵ ص:۴۰۹ (طبع سعید).

(۲) در مختار ج:۵ ص:۳۵۶ (// //).

(۳) در مختار ج:۵ ص:۳۵۸ (// //).

کتاب الحدود

(حدود کا بیان)

اِقرار کے ذریعے زنا کی شرعی سزا نافذ ہونے کی شرائط

سوال:- کیا ایک مرد اور عورت کا یہ اقرار کہ نکاح کے تین ماہ بعد پیدا شدہ بچہ اُن کا ہے، زِنا کا اقرار سمجھا جائے گا۔

۲:- کیا اس مرد اور عورت پر اس جرم میں زِنا کی حد نافذ ہوگی؟

جواب ۱،۲:- صرف اتنے اقرار سے حدِ زِنا جاری نہیں ہوسکتی، حدِ زِنا کے لئے ضروری ہے کہ عدالت میں غیر مبہم الفاظ کے ساتھ زِنا کا اقرار کرے، اور اِمام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک مرتبہ اقرار کرنا بھی کافی نہیں، چار مرتبہ اسی طرح اِقرار کرنا ضروری ہے،(۱) لہٰذا مذکورہ اقرار پر حد جاری نہ ہوگی، البتہ تعزیر ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳/۱۷۲۳/۳۲ ج)

اقرار اور گواہی میں سے کچھ نہ ہونے کی صورت میں ''زنا'' کا جرم ثابت نہ ہوگا

سوال:- زید نے عمر کو بمعہ اہلیہ کے اپنے گھر پر مدعو کیا، عمر بمعہ اہلیہ کے جب زید کے گھر پہنچا تو زید کے اہل وعیال دُوسرے مہمانوں کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے، اس کے بعد زید اور عمر دونوں نمازِ عصر کے لئے مسجد میں چلے گئے، نماز کے بعد زید نے عمر کو مٹھائی لانے کے لئے پیسے دیئے، عمر مٹھائی لینے کے لئے بازار گیا، مٹھائی لائے بغیر عمر، زید کے گھر پر واپس آگیا، اور عمر نے زید کو گھر پر نہیں پایا، اس کے بعد عمر اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنے گھر واپس آگیا، اس کے بعد عمر کی بیوی کا الزام ہے کہ زید نے میرے ساتھ بدفعلی کی، مگر زید اس الزام کا انکار کرتا ہے اور اس فعل کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے، عمر کی بیوی حلفیہ کہتی ہے کہ ایسا ہوا ہے، اور زید بھی حلفیہ کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا، تو ایسی صورت میں شریعت کیا حکم دیتی ہے؟

---

(۱) فی فتح القدیر کتاب الحدود ج:۵ ص:۴ (طبع رشیدیه کوئٹه) الزنا یثبت بالبینة والاقرار ..... وعلیٰ ص:۸ والاقرار أن یقر البالغ العاقل علیٰ نفسه بالزنا أربع مرات فی أربعة مجالس من مجالس المقر.

فی الجوهرة النیرة کتاب الحدود ج:۲ ص:۲۲۴ (طبع قدیمی کتب خانه) الزنا یثبت بالبینة والاقرار ..... (وبعد أسطر فی المتن) والاقرار أن یقر البالغ العاقل علیٰ نفسه بالزنا أربع مرات فی أربعة مجالس من مجالس المقر.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب عمر کی بیوی حلفیہ اقرار کر رہی ہے اور ایسے اِکراہ کا بھی ذِکر نہیں کرتی جس سے وہ بالکل مجبور ہوگئی ہو، تو اس کا گناہ تو ثابت ہوگیا، جس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ توبہ و اِستغفار کرے، صدقِ دِل کے ساتھ توبہ کرلے گی تو اِن شاء اللہ گناہ معاف ہوجائے گا۔[1] لیکن زید چونکہ نہ اقرار کرتا ہے نہ اس کے گناہ پر کوئی گواہ ہے، لہٰذا اس کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوا۔[2]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

احقر محمد تقی عثمانی
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۷/۱۹ الف)

صرف ایک گواہی سے زنا کی شرعی سزا جاری نہیں ہوسکتی، البتہ گواہ کے معتبر ہونے کی صورت میں تعزیری سزا جاری کی جاسکتی ہے

سوال:- اگر کوئی شخص کسی مجاہد یا علاقے کے کمانڈر کو یہ اطلاع دیدے کہ فلاں پرانے گھر میں ایک جوان اور لڑکی کو زنا کرتے ہوئے دیکھا اور اس خبر کی ایک شخص تائید بھی کرے، تو یہ مجاہد اور کمانڈر وہاں جاکر دیکھے تو وہ جوان وہاں سے نکل رہا ہو اور پرانے گھر میں لڑکی موجود ہو اور جو بھی ان سے سوال کرے جواب نہ دے، تو وہ مجاہد اور کمانڈر اس جوان کو بے تحاشا بے دردی بڑی عزتی کے ساتھ مارے لیکن وہ جوان اس مار سے مرا بھی نہیں اور نہ اس کا کوئی عضو ٹوٹا، تو کیا اس مجاہد اور کمانڈر پر شرعی طور پر کچھ عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی فتح الباری ج:۱۲ ص:۱۶۹ (طبع مکتبة الرشد) ..... وقد یتمسک به من قال أنه اذا جاء تائبًا سقط عنه الحد .... وقوّاه بأن الحسنة التی جاء بها من اعترافه طوعًا بخشیة الله وحدهٗ تقاوم بالسیئة الّتی عملها لأن حکمة الحدود الرّدع عن العود وصنیعه ذٰلک دالّ علیٰ ارتداعه فناسب رفع الحدّ عنه لذٰلک .....الخ.

وفی ردّ المحتار مطلب التوبة تسقط الحد قبل ثبوته ج:۴ ص:۴ (طبع سعید) الظاهر أن المراد انّها لا تسقط الحد الثابت عند الحاکم بعد الرّفع الیه امّا قبله فیسقط الحد بالتّوبة .... (وبعد أسطر) رجل أتیٰ بفاحشة ثم تاب وأناب الی الله تعالیٰ فانه لا یعلم القاضی بفاحشته لاقامة الحد علیه لأنّ الستر مندوب الیه وفی شرح الاشباه للبیری عن الجوهر رجل شرب الخمر وزنی ثم تاب ولم یحد فی الدنیا هل یحد له فی الآخرة؟ قال الحدود حقوق الله تعالیٰ الا انه تعلق بها حق الناس وهو الانزجار فاذا تاب توبة نصوحًا أرجو أن لا یحد فی الآخرة فانّه لا یکون أکثر من الکفر والرّدة وانّه یزول بالاسلام والتّوبة.

(۲) وفی الدّر المختار کتاب الحدود ج:۴ ص:۷ و ۸ (طبع سعید) (ویثبت بشهادة أربعة) رجال فی مجلس واحد ...... بلفظ الزنا .... ویثبت أیضًا باقراره صریحًا صاحیًا ولم یکذبه الآخر .....الخ.

وکذا فی البحر الرّائق کتاب الحدود ج:۵ ص:۷ و ۱۲ (طبع رشیدیه).

وفتح القدیر کتاب الحدود ج:۵ ص:۴ و ۸ (طبع رشیدیه کوئٹه).

جواب:- صرف ایک شخص کی گواہی سے زنا کی حدِ شرعی (سو کوڑے یا سنگساری) تو کسی حال نہیں دی جاسکتی[1]، البتہ اگر ایک معتبر شخص کی گواہی اور دُوسرے معتبر قرائن سے یہ غالب گمان ہوجائے کہ مرد و عورت مشتبہ حالت میں پائے گئے ہیں، تو ان کو تعزیری سزا دی جاسکتی ہے،[2] لیکن اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مجاہدین کی متعینہ حکومت کی طرف سے اس کمانڈر کو ایسے معاملات کی سزا دینے کا اختیار دیا گیا ہے تو وہ خود سزا دے سکتا ہے، ورنہ خود سزا دینے کے بجائے اپنے اس افسر کے سپرد کردے جسے سزا دینے کا اختیار حاصل ہو۔ واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۷/۴۰ الف)

حدود ترمیمی بل میں زنا بالجبر کی سزا سے متعلق سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۳ سے اِستدلال کی وضاحت

سوال:- محترم مفتی تقی عثمانی صاحب السلام علیکم

حدود قوانین کے بارے میں جو بحث اس وقت ملک میں جاری ہے، اُس کے حوالے سے آپ کا تفصیلی نقطۂ نظر ''جنگ'' کے کالموں میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اِس ضمن میں میں آپ سے چند باتوں کی وضاحت چاہتا ہوں، اُمید ہے آپ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے زنا بالجبر موجب حد جس کے لئے حدود قوانین میں چار گواہ پیش کرنے کی شرط تھی، کیا پچھلے ۲۷ سال میں کسی مجرم کو دی جاسکی ہے؟ جب یہ ممکن ہی نہیں تو پھر اگر اِس کو بل میں سے نکال دیا گیا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ جب ایک بات بعید از عقل ہے تو پھر اُس کے لئے اِصرار کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟

دُوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک غیرشادی شدہ شخص زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسے کیا سزا دی جائے گی؟ اگر اُس کی سزا بھی سو کوڑے ہے تو پھر یہ سزا تو اُس غیرشادی شدہ کے لئے بھی ہے جو زنا بالرضا کا مرتکب ہوتا ہے جبکہ آپ لکھتے ہیں: ''یہ عقل عام کی بات ہے کہ زنا بالجبر کا جرم رضامندی سے کئے ہوئے زنا سے زیادہ سنگین جرم ہے، لہٰذا اگر رضامندی کی صورت میں یہ حد عائد ہو رہی ہے تو جبر کی صورت میں اس کا اِطلاق اور زیادہ قوّت کے ساتھ ہوگا۔'' (جنگ مؤرخہ ۲۳/نومبر ۲۰۰۶ء) کیسے؟

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۵۳۸ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۶۲ و ۶۳ (طبع سعید)۔

میری تیسری گزارش یہ ہے کہ سورۂ نور کی جس آیت کو آپ نے زنا بالجبر کا شکار ہونے والی خاتون کی بریت کے حوالے سے بطورِ دلیل پیش کیا ہے اُس کا اِس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ آیت تو اُن لونڈیوں کے بارے میں ہے جن سے اُن کے مالک زبردستی پیشہ کرواتے تھے، اُن کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ چونکہ اُنہیں اِس فعلِ بد پر مجبور کیا جارہا ہے اِس لئے اللہ تعالیٰ اُنہیں معاف فرمادے گا۔ اگر آیت کو سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو دُوسرا کوئی معنی لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ شاید یہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ ہمارے ہاں قرآن پاک کی آیات کو سیاق وسباق میں رکھ کر مطالعہ کرنے کا رُجحان بہت کم ہے، دُوسری کوئی وجہ میری سمجھ میں تو نہیں آرہی ہے۔

موجودہ حکومت نے حدود قوانین میں جو ترمیمات کی ہیں وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہیں، یہ بھی ایک اِنسانی کام ہے جس میں بہتری کی گنجائش موجود رہے گی۔ اسی طرح حدود آرڈی نینس مجریہ ۱۹۷۹ء بھی ایک انسانی کام تھا جس کے اندر بنیادی خامیاں موجود تھیں، میں تو حیران ہوتا ہوں کہ مجھ جیسا ایک عام طالبِ علم بھی سمجھتا ہے کہ اُن قوانین میں بنیادی نوعیت کی خامیاں تھیں اور انہیں بہت جلد دُور ہوجانا چاہئے تھا، لیکن ہمارے مذہبی حلقے اُسے حدود اللہ میں مداخلت کا رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جذبات وتعصّبات سے بالاتر ہوکر سوچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں مقلدانہ اندازِ فکر سے آزاد ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

والسلام علیکم
ناصر مصطفیٰ

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سفروں کی وجہ سے آپ کے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔

سورۂ نور آیت ۳۳ کے بارے میں عرض ہے کہ جن لونڈیوں سے زبردستی پیشہ کرایا جارہا ہے، اُن سے زبردستی زنا کرنے والے، خواہ پیسے دے کر کرتے ہوں، زنا بالجبر ہی کے مرتکب تو ہیں۔[۱] اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کی تو مغفرت کا اِعلان فرمادیا، لیکن جن لوگوں نے ان سے زنا بالجبر کیا، اُن کی معافی کا تو کوئی اِعلان نہیں،[۲] لہٰذا سورۂ نور کی آیت نمبر۲ میں بیان کی ہوئی سزا اُن پر بھی عائد ہوگی۔ میرے اِستدلال کی یہ وجہ تھی۔

والسلام
۱۴۲۸/۴/۷ھ

(۱ و ۲) وفی أضواء البیان سورة النور ج:۵ ص:۵۳۲ (طبع دار الفکر بیروت) فإن الله من بعد إکراههن (لهن) غفور رحیم، ذکره عنه القرطبی، وذکره الزمخشری عن ابن عباس رضی الله عنهم جمیعا.

فزیادة لفظة لهن فی قراءة من ذکرنا استشهاد بقراءة شاذة لبیان بقراءة غیر شاذة أن الموعود بالمغفرة والرّحمة، هو المعذور بالإکراه دون المکره؛ لأنه غیر معذور فی فعله القبیح. ....(باقی اگلے صفحے پر)

صرف توبہ اور ستر سے حد ساقط ہو سکنے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خاتون نے اِقرارِ زِنا کیوں کیا؟ نیز زانی کے لئے ستر افضل ہے یا اِقرار؟

سوال:- مکرمی ومحترمی تقی عثمانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''معارف القرآن'' سورۂ مائدہ کی آیت نمبر۳۳ کے مسائل کے مطالعے کے دوران ذہن میں ایک اِشکال نے جنم لیا، جوعرض کرتا ہوں۔ محترم محترم محترم مولانا شفیع صاحب دامت برکاتہم نے شرعی سزاؤں کے ضمن میں پانچ حدود ذِکر کی ہیں اور لکھا ہے کہ ان سزاؤں کی صورت میں توبہ کرنے سے اُخروی حساب معاف ہوجاتا ہے لیکن دُنیوی سزا نہیں۔ اس سے یہ بات ذہن میں پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک زانی عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اِعترافِ جرم (خود حاضر ہوکر، حالانکہ آپؐ کو علم نہیں تھا) کرکے سزا چاہی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر وہ عورت مخلصانہ توبہ کرلیتی اور اپنے گناہ کو پوشیدہ رکھتی تو نہ صرف اُخروی عذاب سے بچ جاتی بلکہ دُنیاوی ذِلت ورُسوائی اور سزا سے بھی۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ اس مسئلے سے لاعلم تھی؟ کیا وہ ضمیر کے ہاتھوں تنگ آکر جذباتی رو میں بہہ کر سزا چاہنے لگی تاکہ اس کے دِل کا بوجھ ہلکا ہوجائے؟ اگر نہیں تو سزا سے پہلے حضور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)............

وفی الدر المنثور ج:۷ ص:۳۹۷ باب:۳۳ (طبع موقع التفاسیر) (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) قال: للمكرهات على الزنا.

رأخرج عبد بن حميد عن قتادة (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) قال: لهن وليست لهم.

وفی اللباب باب:۳۳ ج:۱۲ ص:۱۰۰ (ومن يكرههن فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) اى غفور رحيم للمكرهات والوزر على المكره، وكان الحسن إذا قرأ هذه الآية قال: لهنّ والله لهن.

وفی كتاب الأم ج:۵ ص:۱۷۴ (طبع بيروت) (فإن الله من بعد إكراههن غفور رحيم) نزلت فی الإماء المكرهات أنه مغفور لهن بما أكرهن عليه وقيل غفور أی هو أغفر وأرحم من أن يؤاخذهن بما أكرهن عليه وفی هذا كالدلالة على إبطال الحد عنهن إذا أكرهن على الزنیٰ.

وفی تفسير ابن أبی حاتم سورة النور ج:۱۰ ص:۱۲۷ عن ابن عباسؓ رقم:۱۵۳۲۰ أن جارية لعبدالله بن ابی كانت تزنی فی الجاهلية فولدت أولادًا من الزنا فقال لها مالک لا تزنين قالت: لا والله لا أزنی فضربها فأنزل الله تعالیٰ ولا تكرهوا فتياتكم. وكذا فی تفسير ابن كثير باب:۳۲ ج:۶ ص:۵۵ (طبع مجمع الملک فهد) وكذا فی تفسير الآلوسی باب:۳۳ ج:۱۳ ص:۴۲۷.

وفی التفسير الكبير ج:۱۱ ص:۳۲۳ (طبع موقع التفاسير) فإن الله غفور رحيم بهن لأن الإكراه أزال الإثم والعقوبة لأن الإكراه عذر للمكرهة أما المكره فلا عذر لهٗ فيما فعل الثانی.

وفی تفسير الشعراوی باب:۳۳ ج:۱ ص:۶۳۲۷ لا تكرهوا الإماء على البغاء وقد كن يبكين ويرفضن هذا الفعل وكن يؤذين ويتعرضن للغمز واللّمز ويتجرأ عليهن الناس.

وفی تفسير روح البيان، سورة النور ج:۶ ص:۱۰۸ (طبع دار النشر) غفور رحيم أی لهن وفيه دلالة علیٰ أن المكرهين محرومون منهما بالكلية. نیز دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۴۱۷۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو یہ مسئلہ بتایا نہیں؟ کہ اس طرح تم بچ سکتی تھیں، یا پھر اس میں کوئی شرعی حکمت ہے؟

جواب :- مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ دُرست ہے کہ اگر کسی شخص سے اس قسم کا گناہ خدانخواستہ سرزد ہوجائے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ اسے چھپائے،(۱) اور توبہ کرے۔(۲) لیکن جب ایسا شخص قاضی کے پاس آجائے اور اِعتراف کرلے تو قاضی اُسے صراحۃً چھپانے کا مشورہ نہیں دے سکتا،(۳) البتہ سنت یہ ہے کہ ایک مرتبہ اِقرار کرنے پر قاضی منہ موڑ لے،(۴) جو ایک خفیف سا اِشارہ ہے کہ تم واپس چلے جاؤ،(۵) لیکن تین بار(۶) منہ موڑنے کے بعد جب چوتھی بار وہ اِقرار کرے تو پھر سزا جاری کی جائے گی۔(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔(۸) بحیثیتِ قاضی آپؐ اس سے صراحۃً یہ نہیں فرماسکتے تھے کہ تمہارے اِقرار کرنے سے چھپانا بہتر ہے۔ اُس خاتون کے قلب پر آخرت کا خوف اس درجہ طاری تھا کہ وہ ان خفیف اِشاروں کو نہ سمجھی، اور سزا جاری کرنے پر اِصرار کیا۔(۹) اور تکوینی طور پر اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ مصلحت تھی کہ اُس کے ذریعے دِین کے ایک اہم حکم کا عملی نفاذ کرا کے ہمیشہ کے لئے قانون اور سنت کو محفوظ کرنا تھا۔(۱۰)

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۱/۷ھ

(۱ و ۲) وفی فتح الباری، باب لا یرجم المجنون والمجنونة ج:۱۲ ص:۱۵۸ (طبع مکتبة الرّشد، مکة المکرّمة) ویؤخذ من قضیته أنه یستحب لمن وقع فی مثل قضیته أن یتوب إلی الله تعالٰی ویستر نفسه ولا یذکر ذٰلک لأحد کما أشار به أبوبکر وعمر علٰی ماعز وان من اطلع علٰی ذٰلک یستر علیه بما ذکر ولا یفضحهٗ ولا یرفعه إلی الإمام کما قال صلی الله علیه وسلم فی هٰذه القصة لو سترته بثوبک کان خیرًا لک وبهٰذا جزم الشافعیؒ فقال أحب لمن أصاب ذنبًا فستره الله علیه أن یستر علٰی نفسهٖ ویتوب.

وفیه أیضًا ج:۱۲ ص:۱۵۹ وفیه أنه یستحب لمن وقع فی معصیة وندم أن یبادر إلی التوبة منها ولا یخبر بها أحدًا ویستتر بستر الله وان اتفق انه یخبر أحدًا فیستحب أن یأمره بالتوبة وستر ذٰلک عن الناس کما جریٰ لماعز مع أبی بکر ثم عمر وقد أخرج قصته معهما فی المؤطا .... وفی القصّة أن النبی صلی الله علیه وسلم قال لهزال لو سترتهٗ بثوبک لکان خیرًا لک .... قال الباجی المعنٰی خیرًا لک ممّا أمرتهٗ بهٖ من إظهار أمرهٖ وکان ستره بأن یأمرهٗ بالتوبة والکتمان کما أمرهٗ أبوبکر وعمر وذکر الثوب مبالغة أی لو لم تجد السبیل إلٰی ستره إلّا بردائک ممن علم أمرهٗ کان أفضل مما أشرت بهٖ علیه من الإظهار ...الخ.

وراجع أیضًا إلٰی شرحح البخاری لإبن بطّال ج:۸ ص:۴۴۳ (طبع دار النشر مکتبة الرشد).

وفی عمدة القاری (باب من أصاب ذنبًا دون الحد فأخبر الإمام فلا عقوبة علیه بعد التوبة إذا جاء مستفتیًا) ج:۲۳ ص:۴۴۵ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) إذا تاب قبل أن یقام علیه الحد سقط عنه.

(۳ و ۷) وفی عمدة القاری ج:۲۳ ص:۴۴۵ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) ولا یجوز للإمام العفو عنه إذا بلغهٗ.

وفی الهندیة ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشیدیه) فإذا بین ذٰلک وظهر زناهٗ سألهٗ عن الإحصان .... فإن وصفه بشرائطه حکم برجمه کذا فی التبیین.

(۴ و ۶) وفی صحیح المسلم رقم الحدیث:۴۴۸۳ عن أبی هریرةؓ قال: أتٰی رجل من المسلمین رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو فی المسجد فناداهُ فقال: یا رسول الله! انی زنیتُ، فأعرض عنه حتّٰی ثنّٰی ذٰلک علیه أربع مرات فلما شهد علٰی نفسه أربع شهادات دعاه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: أبک جنون؟ قال: لا، .... (باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) قال: فهل أحصنت؟ قال: نعم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذهبوا به فارجموهُ.
نیز مزید احادیث کے لئے دیکھئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب تکملة فتح الملهم ج:۲ ص:۴۳۷ تا ص:۴۶۳۔
وفي الهندية ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشيديه) وينبغي للإمام أن يزجر المقر عن الإقرار ويظهر الكراهة ويأمر بتنحيقه كذا في المحيط.
وفي فتح الباري، كتاب الحدود ج:۱۲ ص:۱۵۶ (طبع مكتبة الرشد) ان رجلًا من أسلم قال لأبي بكر الصديق ان الآخر زنى قال: فتب إلى الله واستتر بستر الله، ثم أتى عمر كذٰلك، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فأعرض عنه ثلاث مرار حتّٰى إذا أكثر عليه بعث إلى أهله.
(۵) وفي عمدة القارى ج:۲۴ ص:۲ (طبع دار إحياء التراث العربي بيروت) يقول الإمام للمقر لعلّك لمست المرأة أو غمزتها بعينيك أو بيديك وفي بعض النسخ بعد هذا أو نظرت ...الخ.
وفي فتح البارى ج:۱۲ ص:۱۵۹ (طبع مكتبة الرشد) وفيه التثبت في ازهاق نفس المسلم والمبالغة في صيانته لما وقع في هٰذه القصة من ترديده والايماء اليه بالرجوع والإشارة إلى قبول دعواه ان ادعىٰ اكراهًا واخطاءً في معنى الزنا أو مباشرة دون الفرج مثلًا أو غير ذٰلك.
وفي عمدة القارى ج:۲۳ ص:۴۴۰ (طبع دار إحياء التراث) وقال عياض فائدة سؤاله أبك جنون استقراء لحاله واستبعاد أن يلح عاقل بالإعتراف بما يقتضى اهلاكهُ أو لعله يرجع عن قوله.
وفي الهندية ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشيديه) وندب تلقينه لعلك قبلت أو لمست أو وطئت بشبهة وقال في الأصل لعلك تزوجتها أو وطئتها بشبهة والمقصود أن يلقنه ما يكون دارئًا كائنًا ما كان.
(۸) وفي حديث المسلم رقم: ۴۲۹۴ ...... ثم جائته إمرأة من غامد من الأزد فقالت: يا رسول الله! طهّرني، فقال: ويحك ارجعي فاستغفرى الله وتوبى إليه (الحديث). (راجع للتفصيل إلى تكملة فتح الملهم ج:۲ ص:۴۴۸ طبع دار العلوم كراچی).
(۹ و۱۰) نیز اس اصل حکمت کے علاوہ اس خاتون کی طرف سے ستر کے بجائے اقرار کو اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات ستر اُس وقت افضل ہوتا ہے جبکہ کوئی ایسی چیز نہ پائی جائے جو ستر کے مخالف ومتضاد ہو، اور اُس متضاد امر کے پائے جانے کی وجہ سے ستر مشکل ہو۔ جیسا کہ غیر منکوحہ کا حاملہ ہونا۔ ایسی صورت میں بعض حضرات نے فرمایا کہ ستر کے بجائے اقرار اور مرافعہ افضل ہے چنانچہ فتح الباری ج:۱۲ ص:۱۵۸ و ۱۵۹ (طبع مكتبة الرشد) میں ہے:
أنّ الغامدية كان ظهر بها الحبل مع كونها غير ذات زوج فتعذر الإستتار للإطلاع على ما يشعر بالفاحشة ومن ثم قيد بعضهم ترجيح الإستتار حيث لا يكون هناك ما يشعر بضده وان وجد فالرّفع إلى الإمام ليقيم عليه الحد أفضل.
اور چونکہ یہ خاتون حاملہ ہوچکی تھیں لہٰذا انہوں نے اقرار کو افضل سمجھا، اسی لئے اس واقعے کی کئی احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اشارۃً لوٹ جانے اور توبہ واستغفار کرنے کا فرمایا تو خاتون نے عرض کیا کہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ آپ نے جس طرح حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو تعریض وغیرہ کے ذریعے ردّ فرمانا چاہا تھا تو شاید مجھے بھی اسی طرح تعریض فرما رہے ہیں، جبکہ میرا معاملہ ماعز سے یوں مختلف ہے کہ ان کے پاس تو صرف اقرار تھا اور اُن کے لئے آپؐ کی تعریض کی بناء پر اقرار سے رُجوع ممکن تھا مگر میرے معاملے میں واضح قرینہ موجود ہے کہ میں تو باقاعدہ حاملہ ہوچکی ہوں لہٰذا مجھے پاک فرمادیجئے۔
خلاصہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے انہیں توبہ واستغفار کرنے، لوٹنے اور تعریض وتردید کے کئی اشارے پائے جانے کے باوجود اس خاتون نے مذکورہ اسباب (جس کا حاصل خوفِ آخرت ہی ہے جیسا کہ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے تحریر فرمایا) کی بناء پر حد پر اصرار فرمایا۔
وفي حديث صحيح المسلم رقم الحديث: ۴۲۹۴ ...... ثم جاءته إمرأة من غامد من الأزد فقالت: يا رسول الله طهّرني، فقال: ويحك ارجعي فاستغفرى الله وتوبى إليه، فقالت: أراك تريد أن تردّدني كما رددت ماعز بن مالك، قال: وما ذاك؟ قالت: انها حبلى من الزنا، فقال: آنت؟ قالت: نعم، فقال لها: حتّٰى تضعي ما في بطنك. (الحديث)
وفي فتح البارى ج:۱۲ ص:۱۶۰ (طبع مكتبة الرشد)
وأما قول الغامدية تريد أن تردّدني كما رددت ماعزًا فيمكن التمسك به لٰكن أجاب الطيبي بأن قولها انها حبلىٰ من الزنا فيه إشارة إلى أن حالها مغايرة لحال ماعز لأنهما وان اشتركا في الزنا لٰكن العلة غير جامعة لأن ماعزًا كان متمكنًا من الرجوع عن إقراره بخلافها فكانها قالت أنا غير متمكنة من الإنكار بعد الإقرار لظهور الحمل بها بخلافه ...الخ.
وفي شرح سنن أبي داوٗد ج:۲۵ ص:۴۰۶ فالترداد بالنسبة لها قد حصل ولٰكنها طلبت منه ألا يفعل كما فعل بماعز ...الخ.

فصل فی القصاص والدّیات
(قصاص اور دیت کے مسائل کا بیان)

گاڑی کی ٹکر سے کسی کے مرجانے پر قصاص و دیت کا حکم

سوال:- گاڑی کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کوئی مرجائے تو کیا ڈرائیور سے قصاص لیا جائے گا یا اس پر دیت واجب ہوگی؟

جواب:- اگر ایکسیڈنٹ ڈرائیور کی غلطی سے ہوا ہے، ارادہ مارنے کا نہیں تھا تب تو قصاص نہیں، صرف عاقلہ پر دیت آئے گی اور کفارہ واجب ہوگا،[1] اور اگر قتل کرنے ہی کا ارادہ تھا تو قصاص ہوگا۔

واللہ اعلم

۲۲/۳/۱۴۲۴ھ

ایکسیڈینٹ میں موت واقع ہونے کی صورت میں ذمہ دار ڈرائیور کی انشورنس کمپنی سے حاصل ہونے والی رقم ''دیت'' میں شمار کر کے وصول کرنے کا حکم

سوال:- امریکا میں پھوپھی کی بیٹی کو راستہ پار کرتے ہوئے ایک ٹرک کی خاتون ڈرائیور نے سگنل توڑتے ہوئے بچی کو ماردیا، جس سے وہ انتقال کرگئی، ٹرک انشورڈ کی ہوئی تھی، اب انشورنس کمپنی سے بچی کے والدین کو ہرجانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ ہرجانہ دیت ہے یا نہیں؟ کیا دیت کی رقم سے زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ انشورنس کمپنی سے ملنے کی صورت میں حلال ہے یا نہیں؟

بندہ محمد عامر عفی عنہ

خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

جواب:- اصل ہرجانہ ٹرک ڈرائیور کے ذمے لازم تھا، جس کے بقدرِ دیت مطالبے کا حق

---

(۱) فی الدر ج:۶ ص:۵۲۷ (طبع سعید) القتل ..... عمد، وهو أن يتعمد ضربه أى ضرب الآدمى فى أىّ موضع من جسده ..... وموجبه القود عينا .... والثالث خطاء ...... وموجبه ...... الكفارة والدّية على العاقلة والاثم دون اثم القتل .....اهـ.

تھا، اس سے زائد مطالبے کا حق نہیں، لیکن قاتلِ خطا خود زائد دے تو لینا جائز ہے۔ رہا انشورنس کمپنی سے وصول کرنا، تو انشورنس کرانے والے نے اب تک کسی بھی مد میں جتنا پریمیم جمع کرایا ہو اس حد تک تو وصول کرنا بے غبار طور پر جائز ہے، اس سے زائد میں یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ انشورنس کمپنی اس کی عاقلہ کے قائم مقام سمجھی جائے،(۱) اس کو عاقلہ بنانے کے لئے جو عقدِ ناجائز کیا گیا وہ دونوں کا اپنا عمل ہے، جس کے وہ خود ذمہ دار ہیں، لیکن جب عرفاً وقانوناً وہ عاقلہ کے قائم مقام بن گئی تو اس سے وصول کرنے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اگرچہ انشورنس کمپنی کا مال اکثر عقودِ فاسدہ کی وجہ سے حرام ہونے کا گمان غالب ہے، لیکن کفار اہلِ حرب کے مخاطب بالفروع نہ ہونے کی بنا پر گنجائش معلوم ہوتی ہے،(۲) مگر اس پر پورا جزم نہیں، غور کرلیا جائے، اور دُوسرے علماء سے بھی رُجوع کرلیا جائے۔ والسلام

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

۱:- موجودہ دور میں قتلِ شبہ عمد کی صاحبینؒ کی بیان کردہ تعریف اِختیار کرنے کا حکم
۲:- صلح عن دم العمد یا دیتِ عمد میں تین سال کی مہلت ضروری نہیں

سوال:- اِمام ابوحنیفہؒ نے قتلِ شبہ عمد کی تعریف یہ کی ہے کہ ''عمداً ایسی چیز سے قتل کیا جائے جو نہ ہتھیار ہو اور نہ ہی ہتھیار کے قائم مقام ہو'' (ہدایہ ج:۴ ص:۵۶۰، کتاب الجنایات)۔

صاحبینؒ نے یہ تعریف کی ہے: ''شبہ العمد ان یتعمد ضربہ بما لا یقتل بہ غالبًا'' (ہدایہ ج:۴ ص:۵۶۰)۔ اِمام شافعیؒ بھی صاحبینؒ کی تائید فرماتے ہیں لہٰذا بڑے پتھر اور بڑی لاٹھی سے قتل یا زیادہ پانی میں غرق کرکے یا پہاڑی سے گرا کر غرضیکہ ہر اس چیز سے جو اَجزاء کو جدا نہ کرسکے، اِمام صاحبؒ کے نزدیک یہ قتلِ شبہ عمد ہوگا اور صاحبین کے نزدیک قتلِ عمد ہوگا۔

اِمام صاحبؒ نے آلہ قتل ''سلاح'' کو نیتِ قتل کا مظہر قرار دیا ہے، لہٰذا ''سلاح'' سے قتل عمداً قتل ہوگا، اور ''بما لیس بسلاح ولا اجری مجرح السلاح'' سے قتلِ شبہ عمد ہوگا، اور صاحبینؒ کے نزدیک آلہ قتل ''ما یقتل بہ غالبًا'' سے قتلِ عمد ہوگا اور ''بما لا یقتل بہ غالبًا'' سے شبہ عمد ہوگا۔

---

(۱) وفی الهداية ج:۴ ص:۲۲۸ و ص:۲۲۹ كتاب المعاقل (طبع مكتبه رحمانيه) والأصل فی وجوبها علی العاقلة قوله عليه السلام فی حديث حمل بن مالك رضی الله عنه للأولياء قوموا فدوه .... وانما خصوا بالضم لأنه انما قصر لقوة فيه وتلك بأنصاره وهم العاقلة فكانوا هم المقصرين فی تركهم مراقبته فخصوا به .... لأن العقل كان علی أهل النصرة وقد كانت بأنواع بالقرابة والحلف والولاء والعد. وفی عهد عمر رضی الله عنه قد صارت بالديوان فجعلها علی أهله اتباعًا للمعنی ولهٰذا قالوا: لو كان اليوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم أهل الحرفة ...الخ.

(۲) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۱۲۸ و ۱۲۹ (طبع سعيد).

۱- اب قابلِ استفسار بات یہ ہے کہ اس دور میں قتل بالمثقل کے واقعات بکثرت ہیں، اسی طرح آلہ غیر جارحہ سے بھی قتل روزمرہ کا معمول ہے، امام صاحبؒ کی تعریف کو اگر ملکی قانون کا درجہ دیا جائے تو ڈر یہ ہے کہ قتل کے واقعات میں اضافہ ہوجائے گا، کیونکہ شبہِ عمد کی سزا دیت ہے، آج کل لوگوں کے پاس روپیہ عام ہے، پھر روپیہ ادا کرنے میں بھی سہولت ہے کہ اوّل تو عاقلہ دیت ادا کرے گی، پھر اس پر مستزاد یہ ہے کہ تین سال تک ادا کرنے کی مہلت بھی ہے، اس کے مقابلے میں صاحبینؒ کی تعریف اس دور کے مناسب ہے اور عقود رسم المفتی کی عبارت سے واضح ہے کہ قضاء کے معاملات میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ وفی القنیة من باب المفتی الفتویٰ علیٰ قول أبی یوسفؒ فیما یتعلق بالقضاء لزیادة تجربته کذا فی البزازیة من القضاء. (ص:۲۹، مطبوعہ دار الاشاعت کراچی)۔ اور اس بات کی اس کتاب میں تصریح ہے کہ صاحبینؒ کا قول درحقیقت امام صاحبؒ ہی کی کسی بنیاد کی فرع ہوتا ہے (ص:۱۷) اور خود امام صاحب بھی شبہ عمد ہونے کی شرط لگاتے ہیں کہ مارنے والے کا ''قصد تادیب کا ہو اِتلافِ نفس کا نہ ہو'' جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر قصد اِتلافِ نفس کا ہو تو ان کے نزدیک بھی قتل بالمثقل سے قتلِ عمد ہوگا، عبارت یہ ہے: ''یشترط عند أبی حنیفةؒ أی فی شبه العمد ان یقصد التأدیب دون اتلاف'' (الدر المختار ج:۵ ص:۳۵۱ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه بولاق مصر)۔[1]

اعلاء السنن جز:۱۸ میں بھی قتل بالمثقل بشرط القصد سے قصاص واجب ہونے کا ذکر موجود ہے۔[2]

اس پس منظر کے پیشِ نظر گزارش یہ ہے کہ کیا اس دور میں صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر جواب اِثبات میں ہو تو امام صاحبؒ کے مستدل کا جواب کیا ہوگا؟ ان کی ایک دلیل یہ حدیث ہے: ''قتیل السوط والعصا شبه العمد'' نیز ''الا اِنّ قتیل خطاء العمد بالسوط والعصا والحجر فیه الدیة مغلظة مأة من الابل منها أربعون خلفة فی بطونها اولادها'' (بحوالہ احکام القرآن للجصاص ج:۲ ص:۲۲۹، ۲۳۰، باب شبه العمد، مطبوعہ بیروت) ۔ ان روایات میں آلۂ غیر سے قتل کو شبہِ عمد میں شمار کیا گیا ہے۔

۲:- دُوسرا سوال یہ ہے کہ کیا قاضی دیتِ قتل کی مہلت نہ دے تو کیا اس کی کوئی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے یا نہیں؟ شبہ یہ ہے کہ ایک تو ایک شخص کا قریبی قتل ہوا، یہ الگ اس کو صدمہ ہوگا، پھر تین سال

---

(۱) رد المحتار ج:۶ ص:۵۳۰ (طبع سعید).
(۲) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۷ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة).
وفی کنز العمال: لا عمد الا بالسّیف ج:۱۵ ص:۱۱ کتاب القصاص حدیث:۳۹۸۴۲.
وفی اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۱ (طبع ادارة القرآن) لیس معناه ان آلة القود لیس الا السیف کما توهمه الطحاوی.

تک وہ دیت کا انتظار کرے گا، اس سے اس کی تسلی نہ ہوگی۔ راقم کو باوجود تلاش کے مہلت ختم کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

المستفتی

بندہ بشیر احمد
قاضی عدالت باغ، آزاد کشمیر

جواب ا:- موجودہ حالات میں قتلِ شبہ العمد کی وہ تعریف اختیار کی جائے جو صاحبینؒ نے اختیار فرمائی ہے، تو وہ مناسب اور مستساغ ہے،[1] آپ نے اس کے جو دلائل ذکر فرمائے ہیں وہ کافی ہیں، اور شاید اس سے قبل میں نے انہی دلائل کی بناء پر آپ سے اپنی رائے ظاہر کردی تھی۔

۲:- صلح عن دم العمد یا دیتِ عمد جو خود قاتل پر ہوتی ہے، اس میں تو تین سال کی مہلت ضروری نہیں، بلکہ باہمی اتفاق سے جو مدّت بھی مقرّر ہوجائے وہ دُرست ہے، صرّح بہ فی البدائع،[2] بلکہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک مہلت دینا جائز نہیں، لیکن شبہ العمد اور خطاء کی دیت چونکہ عاقلہ ادا کرتی ہے، اس لئے اس میں مہلت دینا عین موافقِ حکمت ہے اور اس کے خلاف فقہاء کا کوئی قول نظر سے نہیں گزرا، اور شبہ العمد میں صاحبینؒ کا قول اختیار کرنے کے بعد اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰/۱۷/۳۰ د)

قتلِ شبہ عمد میں اِمام ابوحنیفہؒ کا مسلک اور اُن کے دلائل کی تحقیق اور موجودہ دور میں شبہ عمد میں صاحبینؒ کی تعریف اختیار کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین درج ذیل مسئلے میں:-

ا:- احناف کے نزدیک قتل بالمثقل موجبِ قصاص نہیں ہے، بشرطیکہ دھاری دار نہ ہو، دلیل میں حدیث "لا قود الا بالسیف" پیش فرماتے ہیں۔

۲:- پھر استیفاء قصاص میں بھی اسی حدیث کو اپنا مستدل بنا کر فرماتے ہیں کہ قصاص مثل فصل دم میں ہوگا بلکہ بہر حالت میں سیف سے ہوگا۔

حدیثِ بالا کا محمل موجبِ قصاص ہے (یعنی قصاص کن حالات کن آلات کی ضرب سے واجب ہوتا ہے) یا استیفاء قصاص ہے؟

---

(۱) تفصیل کے لئے اگلا فتویٰ اور اس کے حوالے ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) دیکھئے: بدائع الصنائع ج:۷ ص:۲۴۷ (طبع سعید)۔

جواب ا:- تمام ائمہ احناف نہیں بلکہ صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قتل بالمثقل موجبِ قصاص نہیں ہوتا، صاحبینؒ اس سے اختلاف فرماتے ہیں، اور امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں بھی علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ صرف اس صورت میں قتل بالمثقل کو غیر موجبِ قصاص کہتے ہیں جبکہ قاتل کا مقصد قتل کرنا نہ ہو، وہ لکھتے ہیں:-

بل مذهبه ان القتل بالمثقل غير موجب للقود إذا لم يكن القتل مقصودًا للقاتل كما نص عليه فى المجتبىٰ ونقل عن العينى فى البناية. (اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۷۵)۔[۱]

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل میں عموماً حدیث: "لا قود الا بالسيف" پیش کرتے ہیں، لیکن ان کے پاس اس بارے میں متعدد صریح دلائل بھی ہیں، مثلاً:-

ا:- مسندِ احمد میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: "ولا عمد الا بالسيف" (كنز العمال ج:۷ ص:۲۸۴ حديث:۳۱۳۲ كتاب القصاص)۔[۲]

۲:- طبرانی اور بیہقی میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہی سے مرفوعاً مروی ہے: "كل شیء خطاء الا الحديد والسيف" اور عبدالرزاق کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "كل شیء سوى الحديد خطاء وللكل خطا أرش." (حوالہ بالا)۔[۳]

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کے اس ارشاد کی تائید میں مرفوعاتِ صریحہ موجود ہیں، البتہ زمانۂ حاضر میں جبکہ قتلِ نفس ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے، اور قتل کی وارداتیں بے حد بڑھ گئی ہیں، اور قتل کے نت نئے طریقے ایجاد ہوگئے ہیں، احقر کا طبعی رُجحان یہ ہے کہ ملکی قانون بناتے وقت امام شافعیؒ یا کم از کم صاحبینؒ کا قول اختیار کیا جائے تو بہتر ہے، احقر نے اس کا تذکرہ کراچی کے بعض اہلِ فتویٰ علماء سے کیا تو انہوں نے اس سے اتفاق فرمایا، اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ زہر سے ہلاک کرنے کی صورت میں علامہ حمویؒ وغیرہ نے قصاص واجب ہونے پر فتویٰ دیا ہے، اور علامہ رافعیؒ نے علامہ سمرقندیؒ سے نقل کیا ہے کہ العمل علىٰ هٰذه الرواية فى زماننا لأنه شاع فى الأرض بالفساد فيقتل دفعا لشره (التحرير المختار ج:۲ ص:۳۲۳)۔ تاہم دُوسرے اہلِ فتویٰ علماء سے بھی استصواب مناسب ہے۔[۴]

---

(۱) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۷ (طبع ادارة القرآن).

(۲ و ۳) كنز العمال ج:۱۵ ص:۱۱ كتاب القصاص حديث:۳۹۸۴۲.

(۴) اب چونکہ پاکستان میں قصاص کا قانون جمہور کے مسلک کے مطابق بنایا گیا ہے، اس لئے اس پر عمل متعین ہے، لأن حكم الحاكم رافع للخلاف۔ (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ)

۲:- "لا قود الّا بالسّیف" کے جملے میں دونوں معنی کا احتمال ہے، یہ بھی کہ قصاص اس صورت کے سوا واجب نہیں ہوتا جبکہ تلوار سے قتل کیا گیا ہو، اور یہ بھی کہ قصاص کا استیفا سوائے تلوار کے کسی اور چیز سے نہ ہونا چاہئے، اعلاء السنن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، وہ لکھتے ہیں: "لیس معناه أن آلة القود لیس الّا السّیف کما توهمه الطحاوی" (اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۷۰)۔ (۱)

لیکن علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ: "فالظاهر انهما حدیثان احدهما فی ایجاب القود انه لا یجب الا بالسیف والثانی فی استیفائه به لا لتوفی الا بالسیف والمراد به اسلام." (ایضاً ج:۱۸ ص:۷۹)۔ (۲)

بہر حال! حدیث میں دونوں معنوں کا احتمال ہے، اور اس کے معنی متبادر یہی ہیں کہ استیفاءِ قصاص صرف تلوار سے ہونا چاہئے، اور قتل بالمثقل کے موجبِ قصاص نہ ہونے پر اس حدیث سے استدلال صریح نہیں ہے اور دوسری احادیث کی موجودگی میں اس حدیث سے استدلال کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ هذا ما عندی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۴/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۴۳۵ الف)

قتلِ خطأ میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟
(مختلف عبارات کی تحقیق)

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد از سلام مسنون عرض ہے کہ بندہ لاہور کے ایک دارالافتاء میں بطور معاون دارالافتاء کام کرتا ہے، ہمارے دارالافتاء میں قتلِ خطأ سے متعلق ایک مرتبہ ایک سوال آیا جس کے جواب میں من جملہ قتلِ خطأ کے دیگر اَحکام کے یہ حکم بھی لکھا گیا کہ قاتل اس قتل کی وجہ سے گناہگار بھی ہوا ہے، لہٰذا توبہ واستغفار کرے، اگرچہ یہ گناہ قتلِ عمد کے گناہ جیسا نہیں جیسا کہ کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ واضح طور سے موجود ہے۔

اس موقع پر بندے کے خیال میں حدیث: "ان اللہ تجاوز عن امتی الخطأ الخ" کی وجہ سے اشکال پیدا ہوا، وجہِ اشکال یہ تھی کہ حدیث میں خطا کے مرفوع ہونے سے مراد حکمِ اُخروی کا مرفوع ہونا ہے، جو کہ عقاب ہے۔

جب حدیث کی رُو سے خاطی سے حکمِ اُخروی یعنی عقاب مرفوع ہے تو قتلِ خطأ کی صورت میں

---

(۱) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۱ (طبع ادارة القرآن).
(۲) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۹۲ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامية).

قاتل پر گناہ کیوں؟ اور اس سے حکمِ اُخروی مرفوع کیوں نہیں؟

اس اِشکال کا جواب تلاش کرنے کے لئے بندے نے اپنی سی بساط کے مطابق کتبِ فقہ وفتاویٰ اور کتبِ تفسیر وشروحِ حدیث کو دیکھا لیکن جو توجیہات ان حضرات نے قتلِ خطأ میں قاتل کو گناہگار قرار دینے کی اِختیار فرمائی ہیں، ان میں سے کسی توجیہ سے تسلی نہیں ہوئی بلکہ بعض عبارات سے قاتل کے گناہگار ہونے کے خیال کو مزید تقویت پہنچی، چنانچہ اَحکام القرآن للجصاص میں ہے:

ليست هٰذه الكفارة مستحقة بالمأثم فيعتبر عظم الاثم فيها لأن المخطى غير آثم فاعتبار الاثم فيه ساقط.

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے:

والمعنى أنه عفا عن الاثم المستوجب عليه بالنسبة الى مأثر الاثم وإلا فالمواخذة المالية كما في قتل النفس خطأً وإتلاف مال الغير ثابتة شرعًا ولذا قال علماءنا في أصول الفقه: الخطأ عذر صالح لسقوط حق الله اذا حصل من اجتهاد ولم يجعل عذرًا في حقوق العباد حتى وجب عليه ضمان العدوان. (ج:١٠ ص:٢٦٣ طبع کوئٹہ)

حاشیہ مشکوٰۃ میں لمعات سے منقول ہے:

ولعل المراد بالتجاوز عدم الاثم فيها لا عدم المواخذة عليهما مطلقًا لأنه يثبت الدية والكفارة في قتل الخطأ ومع ذٰلك الاثم مرفوع في الكل وهو المراد بالتجاوز. (مشکوٰۃ ج:٢ ص:٥٨٤ طبع قدیمی کتب خانہ)

ہدایہ میں ہے:

والخطأ على نوعين .... وموجب ذٰلك الكفارة والدية على العاقلة .... ولا اثم فيه. (ج:٤ ص:٥٢١)

اگرچہ صاحبِ ہدایہ نے ”لا اثم فيه“ سے قتل کا گناہ مراد لیا ہے، باقی ترکِ عزیمت اور ترکِ مبالغہ فی التثبت کا گناہ مرفوع نہیں ہوگا۔

لیکن اِشکال تو یہی ہے کہ خطأ میں ترکِ عزیمت اور ترکِ مبالغہ فی التثبت تو ہوتا ہی ہے اس کے باوجود شارع نے اس سے گناہ کو رفع فرمایا ہے۔

نیز بعض حضرات نے کفارہ کی مشروعیت کو بھی گناہ کی دلیل بنایا ہے، لیکن اس کا جواب اَحکام القرآن للجصاص کی عبارت سے ہوجاتا ہے کہ یہ کفارہ گناہ کی وجہ سے نہیں۔

بندے کو فقہائے کرام پر کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ ان حضرات کی بات سمجھنے میں اپنے قصورِ فہم کا اعتراف ہے۔

اس لئے بندہ بڑوں کی بات کو بڑوں سے سمجھنے کی غرض سے تکلیف دہی پر انتہائی معذرت خواہی کے ساتھ آنجناب سے راہنمائی کا متمنی ہے۔ وللأرض من کاس الکرام نصیب۔

فقط والسلام
عرض کنندہ
محمد رفیق
معاون دارالافتاء والتحقیق
چوبرجی پارک لاہور

جواب:- قتلِ خطأً میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں فقہائے کرامؒ کی عبارتیں مختلف ہیں، بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس میں گناہ ہے، اگرچہ قتلِ عمد کے گناہ سے کم ہے، اور کفارہ اسی کے اِزالے کے لئے مشروع ہوا ہے، چنانچہ درمختار میں فرمایا گیا ہے:

والاثم دون اثم القتل اذ الکفارة تؤذن بالاثم لترک العزیمة.

اس کے تحت علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ:

قوله لترک العزیمة، وهی هنا المبالغة فی التثبت. قال فی الکفایة: وهذا الإثم إثم القتل، لأن نفس ترک المبالغة فی التثبت لیس بإثم، وانما یصیر به آثما اذا اتصل به القتل، فتصیر الکفارة لذنب القتل، و إن لم یکن فیه اثم قصد القتل اهـ تأمل. (رد المحتار ج:۶ ص:۵۳۱)[۱]

اور بعض فقہائے کرامؒ نے گناہ کی نفی کی ہے، جیسا کہ امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت آپ نے خود نقل کی ہے، اور امام طحاویؒ کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ان الکفارات قد تجب فی الأشیاء التی لا آثام فیها علیٰ من کانت منه، من ذلک قوله تعالیٰ فی کتابه: "ومن قتل مؤمنًا خطأً" الآیة.

(مشکل الآثار ج:۱ ص:۳۹۲)[۲]

اور بعض فقہاء نے گناہ کے ذِکر سے سکوت فرمایا ہے۔

لیکن درحقیقت دونوں قسم کے اقوال میں یہ تطبیق بھی ممکن ہے کہ جنہوں نے گناہ کی نفی کی ہے،

(۱) طبع سعید۔
(۲) مشکل الآثار للطحاویؒ باب من اقتطع مال امرئ مسلم بیمین کاذبة. ج:۱ ص:۴۵۰ رقم:۳۸۴.

اس سے مراد قتل کے گناہ کی نفی ہے، اور جنہوں نے اِثبات کیا ہے اس سے مراد عدمِ تثبت کے گناہ کا اِثبات ہے، اور اِختلاف کو حقیقی بھی مانا جائے تو یہ محض نظریاتی اِختلاف ہے، جس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلتا، اس لئے کہ:

۱- اس بات پر سب کا اِتفاق ہے کہ کفارہ واجب ہے۔

۲- اس بات پر کسی کا اِختلاف نہیں کہ کفارہ نہ دیا جائے تو گناہ ہوگا۔

۳- اس بات پر بھی سب کا اِتفاق ہے کہ کفارہ ادا کرنے کے بعد اس پر کوئی اُخروی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

ان تمام عملی نتائج پر متفق ہونے کے بعد تعبیر میں یہ اختلاف ہے کہ بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہ تھا، مگر کفارے سے ختم ہوگیا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہ ہی نہ تھا، اور کفارہ ایک اَمرِ تعبدی کے طور پر واجب ہوا۔

البتہ قرآنِ کریم کے الفاظ سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ تھا، مگر کفارہ سے معاف ہوگیا، اس لئے کہ قرآنِ کریم نے کفارہ کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: "توبةً من الله" (النساء:۹۲)۔

اس آیت کا ترجمہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے اس طرح فرمایا ہے:

"(یہ آزاد کرنا، اور وہ نہ ہوسکے تو روزے رکھنا) بطریق توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرّر ہے۔"

اس آیتِ کریمہ میں صراحت ہے کہ کفارہ بطور توبہ کے مشروع ہوا ہے، اور ظاہر یہی ہے کہ توبہ کسی گناہ پر ہوتی ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ کفارہ سے توبہ ہوجائے گی، اس لئے الگ سے توبہ واستغفار کی ضرورت نہ رہی۔

اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ قتلِ خطأ پر گناہ کا ہونا حدیث "رفع عن أمتی الخطأ والنسیان"[1] کے معارض معلوم ہوتا ہے، اس کے دو جواب ممکن ہیں:

ایک یہ کہ اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ اُس فعل کا اصل گناہ خطا کی صورت میں مرفوع ہے، چنانچہ قتل کی صورت میں اصل گناہ قتلِ عمد کا گناہ تھا جو خطا کی وجہ سے مرفوع ہوگیا، لیکن کسی اور جہت سے گناہ ہونا، اس کے معارض نہیں، مثلاً قلّتِ تثبت کا گناہ پھر بھی ہوسکتا ہے جو ایک جان کی ہلاکت کا سبب بنا۔

---

(۱) وفی جامع الأحادیث حرف الرّاء ۱۲۷۶۳ رفع عن أمتی الخطاء والنّسیان.
وکذا فی الجامع الکبیر للسیوطیؒ ۱۲۹۱۱ أخرجه الطبرانی ج:۲ ص:۹۷ رقم:۱۴۳۰.

دُوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ قتلِ خطا اس کلیہ سے بنصِ قرآن مستثنیٰ ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کسی معصوم جان کا ہلاک ہوجانا اِنتہائی سخت معاملہ ہے۔ اور اس میں بلاقصد تسبّب بھی موجبِ گناہ ہے۔ اور ترکِ مبالغہ فی التحرز والتثبت دُوسرے معاملات میں چاہے موجبِ گناہ نہ ہو، لیکن اس سنگین معاملے میں موجبِ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ البتہ عدمِ قصد کے عذر کی وجہ سے معافی کے لئے صرف کفارہ کوتوبہ کے قائم مقام قرار دے دیا گیا ہے، الگ سے توبہ کی ضرورت نہیں قرار دی گئی۔

هذا ما ظهر لی
واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی
۱۰رشعبان ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۸۶/۳۴)

***

فصل فی التّعزیر
(تعزیر اور سزا دینے کے مسائل کا بیان)

بہتان اور اِلزام تراشی پر تعزیری سزا کا اِختیار صرف عدالت کو ہے، عوام کو نہیں

سوال:- زید اور بکر ایک تنظیم کے ذیلی ادارے کے عہدے داران تھے، زید بکر کے ماتحت کام کرتا تھا، بکر نے زید کے خلاف کچھ باتیں کیں اور زید نے بکر پر الزامات لگائے، انتظامی کمیٹی نے بکر کے خلاف الزامات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور فیصلہ کردیا کہ چونکہ زید اور بکر کے درمیان اختلافات کی وجہ سے اعتماد کی فضا باقی نہیں رہی، اس لئے ماتحت ملازم زید کو ادارے سے برطرف کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد زید اپنا چارج چھوڑ کر گھر چلا گیا۔ اس کے چند دن بعد بکر نے ایک پریس ریلیز جاری کر کے اخبارات میں شائع کروایا اور مختلف ذمہ داروں کو دیا، اور بھجوایا کہ میں نے انتظامی کمیٹی کے مشورے سے زید کو مالیات میں خورد بُرد کرنے، قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرنے اور نظم کی پابندی نہ کرنے، غلط بیانی اور ڈائری میں فرضی اندراج کرنے کی بناء پر برطرف کردیا ہے۔ زید نے جب رسائل و اخبارات میں پڑھا تو اس نے ان بہتانات کے خلاف تنظیم کے مجاز سربراہ کے پاس تحریری شکایت اپیل کی، مجاز سربراہ نے اپنا نمائندہ انکوائری کے لئے مقرّر کیا، انکوائری اور تحقیقات کے دوران بکر زید پر لگائے گئے بہتانات ثابت نہ کرسکا، اور انکوائری آفیسر کے متنبہ کرنے اور کہنے کے باوجود بکر نے اس صریح ظلم پر زید سے معافی مانگنے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ زید اگر چاہے تو عدالت میں میرے خلاف دعویٰ کردے، میں خود بھگت لوں گا۔ اور کہا کہ ''اس شخص سے تو معذرت نہیں کروں گا'' اس پر انکوائری آفیسر نے اپنی رپورٹ میں شدید دُکھ کا اظہار کیا ہے، اور مزید لکھا ہے کہ مجلسِ عاملہ کے فیصلے میں جو اِلزامات درج نہیں وہ بھی پریس ریلیز میں بلاوجہ اور بغیر کسی معقول ثبوت کے اپنے غصّے کی

وجہ سے اور اپنی توہین کا انتقام لینے کی غرض سے شامل کردیئے گئے۔ انہوں نے ایسی سنگین غلطی کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ انکوائری آفیسر نے بدیں وجوہ بکر کے خلاف تادیبی کارروائی کی سفارش کی ہے۔ بکر نے پریس ریلیز میں مزید دروغ گوئی یہ کی کہ اس نے زید کو برطرف کیا ہے، مزید یہ کہ انتظامی کمیٹی کے مشورے سے برطرف کیا ہے۔

زید کا کہنا ہے کہ جب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ بکر نے اس پر بہتانات (قذف) لگائے ہیں، نیز خلافِ واقعہ دروغ گوئی کرکے زید کو خود برطرف کرنے انتظامی کمیٹی کے مشورے سے برطرف کرنے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعے مشتہر کرکے صریح ظلم کرکے اُسے چاردانگ عالم میں رُسوا کیا ہے، جس سے اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے، اور مزید یہ کہ بکر نے تنظیم کے سربراہ کے نمائندے کی عدم اطاعت کی ہے، تو ان جرائم کی وجہ سے جو کہ قابلِ تعزیر ہیں بکر مردود الشہادت اور ساقط الاعتبار اور منصب کے لئے نااہل ہوگیا ہے، اس لئے تادیب کے طور پر بکر کی بنیادی رُکنیتِ تنظیم ختم کی جانی چاہئے، اور ادارے کے عہدے سے برطرف کیا جانا چاہئے، اور تعزیر کے طور پر سزا دی جانی چاہئے۔

براہِ کرم شرعی نقطۂ نگاہ سے صراحت فرمائیں کہ زید کا یہ مطالبہ کہاں تک حق بجانب ہے؟

جواب:- اگر واقعاتِ مندرجہ دُرست ہیں اور زید اُن اِلزامات سے واقعۃً بَری ہے جو بکر نے اس پر لگائے ہیں، تو بکر نے بہتان طرازی کا ارتکاب کرکے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے،[۱] اگر وہ اپنے اس گناہ سے تائب نہ ہو اور زید سے معافی نہ مانگے،[۲] تو کسی ایسے عہدے کا مستحق نہیں ہے جس

(۱ و ۲) وفی سنن أبی داوٗد ج:۲ ص:۳۲۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کل المسلم علی المسلم حرامٌ مالہ وعرضہ ودمہٗ حسب امرئ من الشر أن یحقر أخاہ المسلم.

وفی سنن أبی داوٗد کتاب الأدب باب من ردّ عن مسلم غیبۃ ج:۲ ص:۳۲۷ (طبع رحمانیہ) عن سھل بن معاذ بن أنس الجھنی عن أبیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من حمیٰ مؤمنًا من منافق أراہٗ قال بعث اللہ ملکًا یحمی لحمہ یوم القیامۃ من نار جھنّم، ومن رمی مسلمًا بشیءٍ یرید شینہ بہ حبسہ اللہ علیٰ جسر جھنّم حتّٰی یخرج ممّا قال.

وکذا فی مسند أحمد حدیث معاذ بن أنس الجھنی رقم الحدیث: ۱۵۵۸۶ ج:۱۲ ص:۲۵۸ (طبع دارالحدیث القاھرۃ) ومشکوٰۃ المصابیح ج:۵ ص:۴۲۴ (طبع قدیمی) وفی مرقاۃ المفاتیح ج:۹ ص:۲۳۸ (طبع امدادیہ ملتان) أی قذف مسلمًا ..... بشیءٍ أی من العیوب یرید بہ شینہ أی عیبہ حبسہ اللہ أی وقفہٗ علیٰ جسر جھنّم وھو صراط ممدود ..... حتّٰی یخرج ممّا قال أی من عھدتہ والمعنی حتّٰی ینقی من ذنبہ ذٰلک بارضاء خصمہ أو بشفاعۃ أو بتعذیبہ بقدر ذنبہ وکذا فی بذل المجھود ج:۵ ص:۲۵۵ (طبع معھد الخلیل کراچی).

وفی شرح الفقہ الأکبر مسئلۃ فی التوبۃ وشرائطھا ص:۱۵۹ و ۱۶۰ (طبع قدیمی) امّا اذا قال بھتانًا بأن لم یکن ذٰلک فیہ فانہ یحتاج الی التوبۃ ..... فلیس شیء من العصیان أعظم من البھتان .....الخ.

سے ماتحتوں کے حقوق وابستہ ہوں۔ ایک اسلامی عدالت اس بہتان طرازی پر اُسے تعزیری سزا بھی دے سکتی ہے، لیکن یہ تعزیری سزا عام لوگوں کو دینے کا اختیار نہیں ہے، صرف عدالت کے ذریعے دِلوائی جاسکتی ہے۔ [1]

واللہ اعلم

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۵/۳۹ د)

مجلسِ گناہ میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ توڑنے پر شرعاً کوئی تعزیر مقرّر نہیں، نیز تعزیری سزائیں جاری کرنے کا اختیار صرف قاضیٔ شرعی کو ہے

سوال:- برادری نے ایک ماتم کے موقع پر فیصلہ کیا کہ آئندہ شادیوں میں ڈھول بجانے اور لاؤڈ اسپیکر میں گانوں پر پابندی کی جائے، اور جو نہ مانے اس کا بائیکاٹ کیا جائے، تمام برادری اس پر متفق ہوگئی، اس موقع پر امام مسجد نے بھی بطورِ دھمکی وتنبیہ کہا کہ جو یہ حرکت کرے گا اس کا نکاح نہیں پڑھایا جائے گا۔ کچھ دن بعد برادری میں ایک شادی ہوئی جس میں ڈھول کا بجانا اور لاؤڈ اسپیکر پر گانے شروع ہوگئے، اِمامِ مسجد نے لوگوں کو بتایا کہ وعدہ خلافی ہو رہی ہے، اِمام نے ذمے دار لوگوں کو بھیجا کہ ان کو عدہ خلافی سے منع کریں، لیکن اہلِ تقریب نہ رُکے، ڈھول بجاتے رہے، اس کے بعد جب موقع نکاح کا آیا تو یہاں سوشلسٹ آدمی جو اپنے نظریے میں سوشلزم کو دِین سمجھتا ہے، وہ اِمام کو کہتا ہے کہ نکاح مت پڑھاؤ کیونکہ تم نے کہا ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کا نکاح نہیں پڑھایا جائے گا، اِمام نے کہا کہ میں نے یہ بطورِ دھمکی کہا ہے، حقیقت میں یہ کام مانعِ نکاح نہیں ہے، نکاح کے جواز کی شرائط اور ہیں، اِمام نے نکاح پڑھایا اور نکاح کے وقت ڈھول بند کردیا گیا۔ اب وہ اشتراکی لیڈر یہ افواہ پھیلا رہا ہے کہ اِمام نے چونکہ وعدہ خلافی کی، اس وجہ سے اس کو تعزیر دے دی جائے۔ اِمامِ مسجد فرمارہا ہے کہ میں سرکاری نکاح رجسٹرار ہوں، مجبوری کی وجہ سے میں نے نکاح پڑھایا ہے، اس کے علاوہ اگر نکاح نہ پڑھاتا تو فساد کا خطرہ تھا، کیونکہ ساری برادری نکاح میں شرکت کرچکی تھی، اور اِمامِ محلّہ بھی ہے نہ پڑھانے کی صورت میں اِمامت سے نکالنے کا بھی خطرہ تھا، تو کیا اس صورت میں اِمام کے لئے تعزیرِ شرعی ہے؟

جواب:- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اِمام نے لوگوں کے سامنے جو یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی نکاح

---

(۱) وفی الهندیة کتاب الحدود ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع رشیدیه) ورکنهٗ اقامة الامام أو نائبه فی الاقامة.

وفی بدائع الصنائع کتاب الحدود ج:۷ ص:۵۷ (طبع سعید) ...... امّا الّذی یعم الحدود کلها فهو الامامة وهو أن یکون المقیم للحد هو الامام او من ولاه الامام وهٰذا عندنا.

نہیں پڑھائے گا جس کی تقریب میں ڈھول باجا، یا گانا بجانا ہو، تو اَب کسی ایسی مجلسِ نکاح میں جاکر نکاح پڑھانا اس کے لئے دو وجہ سے ناجائز تھا، ایک اس وجہ سے کہ جس مجلس میں یہ لہو ولعب ہو رہے ہوں اس میں جان بوجھ کر شرکت کرنا ناجائز ہے،(۱) دُوسرے اس وجہ سے کہ یہ وعدہ خلافی ہے، جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے وہ تو صورتِ مسئولہ میں محقق نہیں ہوئی کہ جس وقت امام صاحب نکاح پڑھانے گئے اس وقت ڈھول باجا موقوف کردیا گیا تھا۔ اب دُوسری وجہ رہ جاتی ہے، سو درحقیقت امام صاحب کا یہ وعدہ پوری برادری کے ساتھ ایک معاہدے کی حیثیت رکھتا تھا، جب پوری برادری نے یہ معاہدہ پہلے توڑ دیا تو اَب امام صاحب کے لئے بھی بحیثیتِ معاہدہ اس کی خلاف ورزی کی گنجائش تو نکل آئی، لیکن اگر امام صاحب کا اعلان برادری کے ساتھ معاہدے پر موقوف نہیں تھا، بلکہ انہوں نے ذاتی طور پر لوگوں کے سامنے یہ وعدہ کیا تھا تو انہیں اس وعدہ خلافی پر توبہ و استغفار کرنا چاہئے، اس قسم کے معاملات میں شریعت کی طرف سے کوئی تعزیر مقرّر نہیں ہے، اور نہ قاضیٔ شرعی کے سوا کسی اور کو تعزیر جاری کرنے کا اختیار ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۰/۱۱/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱/۱۱۱۲ الف)

---

(۱) وفی مرقاة المفاتیح شرح المشکوة ج:۶ ص:۲۵۴ و۲۵۵ (طبع امدادیه ملتان) عن سفینة انّ رجلًا ضاف علیّ بن أبی طالب رضی الله عنه فصنع لهٗ طعامًا فقالت فاطمة: لو دعونا رسول الله صلی الله علیه وسلم فاکل معنا، فدعوهٗ فجاء فوضع یدیه علیٰ عضادتی الباب فرأی القرام قد ضرب فی ناحیة البیت فرجع قالت فاطمة رضی الله عنها فتبعتهٗ فقلت: یا رسول اللّٰہ ما ردّک؟ قال: انّه لیس لی - أو - لنبی أن یدخل بیتًا مزوقًا. رواه أحمد وابن ماجة. قال المُلّا علی القاری رحمه الله وفیه تصریح بأنّه لا یُجاب دعوة فیها منکر وفیه انّه لو کان منکرًا لأنکر علیها ولکن نبه بالرّجوع الیٰ انّه ترک الاولیٰ فانّه من زینة الدنیا وهی موجبة لنقصان الأُخریٰ.

وفی تبیین الحقائق کتاب الکراهیة فصل فی الأکل والشرب ج:۷ ص:۲۹ و ۳۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وان کان هناک لعب وغنا قبل أن یحضرها فلا یحضرها لأنّه لا یلزمه اجابة الدّعوة اذا کان هناک منکر.

وفی الهندیة کتاب الکراهیة الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات ج:۵ ص:۳۴۲ و ۳۴۳ (طبع رشیدیه).
ومن دعی الی ولیمة فوجد ثمة لعبًا أو غناء فلا بأس ان یقعد ویأکل فان قدر علی المنع یمنعهم وان لم یقدر یصبر وهٰذا اذا لم یکن مقتدیٰ به امّا اذا کان ولم یقدر علیٰ منعهم فانّه یخرج ولا یقعد ولو کان ذٰلک علی المائدة لا ینبغی أن یقعد وان لم یکن مقتدیٰ به وهٰذا کلّه بعد الحضور وامّا اذا علم قبل الحضور فلا یحضر ..... الخ.

وفی الهدایة کتاب الکراهیة ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع شرکت علمیه) هٰذا اذا لم یکن مقتدیٰ فان کان ولم یقدر علیٰ منعهم یخرج ولا یقعد لأنّ فی ذٰلک شین الدین وفتح باب المعصیة علی المسلمین. (وفی طبع رحمانیه ص:۴۵۳ و۴۵۴)

وفی الهدایة ج:۴ ص:۴۵۴ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن دعی الیٰ ولیمة أو طعام فوجد ثمه لعبًا أو غناءً فلا بأس بأن یقعد ویأکل .... وهٰذا اذا لم یکن مقتدی فان کان ولم یقدر علی منعهم یخرج ولا یقعد لأنّ فی ذٰلک شین الدین وفتح باب المعصیة علی المسلمین والمحکی عن أبی حنیفة فی الکتاب کان قبل أن یصیر مقتدی ولو کان ذٰلک علی المائدة لا ینبغی ان یقعد وان لم یکن مقتدیٰ لقوله تعالیٰ: "فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ" وهٰذا کله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا یحضر لأنّه لم یلزمه حق الدعوة.

وفی الفتاویٰ البزازیة علی الهندیة ج:۶ ص:۳۵۹ (طبع رشیدیه) استماع صوت الملاهی کالضرب بالقضیب ونحوه حرام قال علیه السلام استماع الملاهی معصیة والجلوس علیها فسق والتلذذ بها کفر أی بالنعمة.

لواطت کی شرعی سزا جاری کرنے کا اختیار حکومت کو ہے

سوال:- ایک صاحب کا ابتلاء باللواطت بمعہ تعیین مقام یہ صاحب اِمامِ مسجد تھے، آخر پکڑے گئے، اور نکال دیئے گئے، اور رُوپوش ہوکر کہیں دُور دراز مقام میں ملازمت کرلی۔ سائل اس اِمام صاحب کے تعاقب میں ہے، اور شرعی سزا معلوم کرکے اُس پر جاری کرنا چاہتا ہے .... الخ۔

جواب:- لواطت کا مرتکب فاسق ہے، اور جب تک وہ اس عمل سے صدقِ دِل سے توبہ نہ کرے، اس کو اِمام بنانا جائز نہیں۔ البتہ شرعی سزائیں جاری کرنے کا حق صرف اسلامی حکومت کو ہوتا ہے،[1] اور موجودہ قوانین میں چونکہ شرعی حدود نافذ نہیں ہیں اس لئے اس عمل کی سزا معلوم کرنا بے کار ہے۔

نوٹ:- اس قسم کے سوالات میں کسی معین شخص کا نام و نشان اِستفتاء میں ذکر نہ کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۱۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع
۱۳۸۷/۱/۲۷ھ

***

(۱) وفی الهندیة کتاب الحدود ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع رشیدیه) ورکنه اقامة الامام أو نائبه فی الاقامة.
وکذا فی بدائع الصنائع ج:۷ ص:۵۷ کتاب الحدود ومثله فی کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة ج:۵ ص:۲۴۹ کتاب الحدود.

فصل فی القسامة

(قسامت یعنی کسی جگہ پائے جانے والے مقتول پر اہلِ محلّہ سے قسم لینے کا بیان)

کسی بستی کی طرف منسوب اُس کی مخصوص شارعِ عام میں پائی جانے والی لاش کی قسامت اُس بستی والوں پر ہوگی

سوال:- ایک لاش ایک بستی کے قریب اُس کی سڑک پر ملی، وہ سڑک ایسی ہے کہ اُسے اسی بستی کی طرف ہی مکمل طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ تو کیا اس سڑک پر اگر لاش ملے تو اس بستی والوں پر قسامت آئے گی یا نہیں؟ واضح رہے کہ اس سڑک سے اس بستی کا کچھ فاصلہ بھی ہے لیکن بہت زیادہ نہیں ہے، نیز یہ سڑک اسی بستی کے لئے تقریباً مخصوص ہے، پہلے ایک فتویٰ دیا گیا تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ اس بستی والوں پر قسامت نہیں آئے گی، صحیح شرعی صورتِ حال سے برائے کرم آگاہ فرمائیں۔

جواب:- مخدوم گرامی قدر و مکرّم جناب مولانا تاج محمد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نہایت شرمندہ ہوں کہ آنجناب نے جو اِستفتاء دستی طور پر احقر کو دیا تھا، اس کے جواب میں بہت تأخیر ہوئی، اس سے آنجناب کو جو تکلیف پہنچی، اس پر معذرت کے لئے احقر کے پاس الفاظ نہیں، اُمید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ اب آنجناب نے دوبارہ سوال و جواب متعلقہ عبارتوں کے ساتھ ارسال فرمائے تو مسئلے پر غور کرنے کا موقع ملا، دونوں سوال و جواب اور متعلقہ عبارتیں دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ دونوں فتووں میں اصل حکم کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں۔ یہ مسئلہ غیر مختلف فیہ ہے کہ اگر شارعِ عام پر ایسی جگہ لاش ملے جو کسی بستی سے اتنی قریب ہو کہ وہاں تک مقتول کی آواز پہنچ سکتی ہو تو اس بستی والوں پر قسامت ہوگی، لیکن اگر وہ جگہ بستی سے اتنی دُور ہے کہ مقتول کی آواز بستی تک نہیں پہنچ سکتی تو اس صورت میں بستی والوں پر قسامت نہیں، چنانچہ متعلقہ تمام مسائل کو نہایت جامع انداز میں علامہ رافعیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

وظهر منه انه كما لا يناسب العمل بإطلاق المتون لا يناسب الإفتاء بوجوب القسامة والدّية على أهل ادنى الحال مطلقًا، والحاصل أن القتيل إن وجد في الشارع الأعظم ونحوه فان وقع عند الازدحام فلا قسامة، وديته علىٰ بيت المال، وإن وقع في موضع لو صيح فيه يسمعه أهل العمران فالقسامة والدّية على أدنى المحال، وفي موضع بعيد منتفع به بين المسلمين فهي علىٰ بيت المال، وإلا فهدر اهـ.“

(تقريرات الرافعي ج:٦ ص:٣٣٩)(طبع جديد، ط سعيد)

لہٰذا اس عبارت میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ جس اِستفتاء کے جواب میں ابتداءً فتویٰ جاری ہوا، اس میں یہ صراحت تھی کہ جس جگہ مقتول پایا گیا وہ بستی سے ۵۰۰ میٹر دُور تھی، اور اس جگہ اور بستی کے درمیان کھیت اور کنویں بھی حائل تھے، لہٰذا جواب دینے والے صاحب نے سمجھا کہ ۵۰۰ میٹر یعنی نصف کلومیٹر کے فاصلے سے عام طور پر آواز نہیں پہنچتی، بالخصوص جبکہ درمیان میں کھیت اور کنویں بھی حائل ہوں، البتہ مناسب یہ تھا کہ وہ جواب میں یہ صراحت کر دیتے کہ یہ جواب اس صورت میں ہے جب واقعۃً فاصلہ اتنا ہو کہ آواز نہ پہنچے۔

دراصل حکم کا مبنیٰ یہ ہے کہ شارعِ عام اگر بستی والوں کی طرف اس طرح منسوب کی جاسکتی ہو کہ اس کی حفاظت اور اس کی نگہداشت کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہو، تو شارعِ عام کے اس حصے پر پائے جانے والے مقتول کے سلسلے میں قسامت ان پر عائد ہوگی، اس بات کی علامت کے طور پر فقہائے کرام نے چیخ کی آواز پہنچنے کو ذکر فرمایا ہے۔

لہٰذا نفسِ مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سارا مدار صورتِ مسئولہ کے صحیح صحیح تعین پر ہے، ظاہر ہے کہ آپ وہاں سے قریب ہیں، اور آپ تمام باتوں کو مدِ نظر رکھ کر فیصلہ فرماسکتے ہیں، اگر وہ جگہ واقعۃً ایسی ہے کہ اسے آواز پہنچنے کی وجہ سے بستی سے منسوب کیا جاسکتا ہو تو بے شک قسامت ہوگی، ورنہ نہیں۔ یہ بات آپ خاص طور پر ملاحظہ فرمالیں کہ اگر واقعۃً فاصلہ ۵۰۰ میٹر کا ہے، اور بیچ میں کھیت وغیرہ حائل ہیں تو بظاہر آواز کا پہنچنا بعید معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ جو سوال سب سے پہلے آیا تھا، اس میں غیر واضح انداز میں یہ بھی تذکرہ تھا کہ دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہوئی تھی، اور اس جگہ پر کوئی خون بھی نہیں پایا گیا، ان پہلوؤں پر بھی تحقیق اور غور کی ضرورت ہے۔

والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم: عبداللہ میمن

۱۴۱۴/۱۲/۲۳ھ

کتاب الجنایات

(جنایت کے مسائل کا بیان)

مالک کی اجازت کے بغیر اس کے باڑے میں کسی کا اپنا اُونٹ لے جانا اور اس جانور کا دُوسرے جانوروں کو ہلاک کرنے کا حکم

سوال:- زید کا ایک اُونٹ ہے، اور عمرو کا اُونٹوں کا ایک گلہ، ایک دن زید نے چاہا کہ وہ اپنا اُونٹ عمرو کے اُونٹوں کے گلے کے ساتھ کردے، لیکن عمرو نے یہ کہتے ہوئے کہ تمہارا (یعنی زید کا) اُونٹ بہت بدمعاش ہے اور خطرہ ہے کہ وہ میرے اُونٹوں کو ہلاک نہ کردے منع کردیا، مگر زید نے عمرو کے منع کرنے کے باوجود اپنا اُونٹ عمرو کے گلے میں چھوڑ دیا، دُوسری صبح عمرو کے اُونٹوں میں سے دو اُونٹ مُردہ پائے گئے اور زید کا اُونٹ ان کے ساتھ پایا گیا، (واضح رہے کہ زید کے اُونٹ کے ساتھ عمرو کا صرف ایک ہی اُونٹ برابر ہے باقی سب چھوٹے ہیں) مُردہ اُونٹوں کے جسموں کے مختلف مقامات پر اُونٹ کے دانتوں کے نشانات اور کف پایا گیا، اس کے علاوہ اُونٹوں کے رگیدنے کے نشانات بھی پائے گئے ہیں، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو کے اُونٹوں کو زید کے اُونٹ نے ہلاک کیا ہے جو مندرجہ ذیل شک کو یقین میں بدلنے کے موجب ہیں۔

۱:- زید کا اُونٹ بدمعاشی اور نقصان رسانی میں مشہور ہے، اور علاقے کے لوگ اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

۲:- بقول بکر (جس سے زید نے یہ اُونٹ خریدا تھا) اُس نے اپنا یہ اُونٹ اسی لئے بیچا تھا کہ اس کی عادات بدتھیں اور خطرہ تھا کہ کہیں کسی انسان کو ہلاک یا زخمی نہ کردے۔

۳:- اس وقوعہ سے چند دن قبل علاقے کے نمبردار نے ایک ایسی پنچائت میں جس میں زید بھی حاضر تھا اُونٹوں کی نگرانی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے زید کا نام بطورِ خاص لیا اور صریح الفاظ میں اُس کو تنبیہ کی کہ وہ اپنے اُونٹ کی خطرناکی کے پیشِ نظر کسی بھی متوقع حادثے سے بچنے کے لئے اپنے اُونٹ کی نگرانی کرے۔

۴:- معزّزینِ قوم نے مردہ اُونٹوں کا موقع پر معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ زید کے اُونٹ نے ہلاک کیا ہے۔

الف:- شرع کی رُو سے زید پر عمرو کے اُونٹوں کا ضمان آئے گا یا نہیں؟ اگر آئے گا تو کس شرعی اُصول کی رُو سے؟

ب:- اُونٹ کی ہلاکت کے عینی شاہد نہیں ہیں، کیا زید کے اُونٹ کا بدمعاش مشہور ہونا ثبوت کے لئے کافی ہے یا کوئی اور ثبوت دینا ہوگا؟

ج:- کیا بکر کا بیان اور نمبر۳ میں نمبردار کی تنبیہ زید کے اُونٹ کا عمرو کے اُونٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے؟

جواب:- اگر سوال میں مندرجہ تمام واقعات دُرست ہیں، اور زید نے واقعۃً عمرو کی اجازت اور اِطلاع کے بغیر اپنے شریر اُونٹ کو عمرو کے اُونٹوں کے باڑے میں چھوڑا تھا تو صورتِ مسئولہ میں زید پر عمرو کے ہلاک شدہ اُونٹوں کا ضمان واجب ہے، بشرطیکہ سوال میں مندرج قرائن اس قدر واضح ہوں کہ بستی کے تجربہ کار لوگوں کو اس بات کا گمان غالب ہوجائے کہ عمرو کے اُونٹوں کو زید کے اُونٹ ہی نے ہلاک کیا ہے، اس مسئلے میں فقہائے کرامؒ کی متعلقہ تصریحات حسبِ ذیل ہیں:-

فتاویٰ بزازیہ میں ہے: ”فی داره أبعرة أدخل عليها آخر بعيرًا مغتلما أو غير مغتلم بإذن صاحبها فقتل الداخل ذٰلك الابل لا يضمن، وإن بلا اذنه يضمن.“ (بزازية علىٰ هامش الهندية ج:٦ ص:٤٠٣)[1]۔

---

(١) هامش الهندية (الرابع فى الجناية علىٰ غير بنى آدم ...الخ) (طبع رشيديه كوئٹه).

وفى ردّ المحتار، كتاب الجنايات، باب جناية البهيمة والجناية عليها ج:٦ ص:٦١٢ (قبيل باب جناية المملوك والجناية عليه) (طبع سعيد) اذا كان فى داره بعير فأدخل عليه آخر بعيرًا مغتلمًا أو لا فقتل بعيرهُ ان بلا اذن صاحبها يضمن كما فى البزازية أقول ويظهر أرجحية هٰذا القول لموافقته لما مرّ أوّل الباب من أنّهُ يضمن ما أحدثته الدّابة مطلقًا اذا أدخلها فى ملك غيره بلا اذنه لتعديه .....الخ.

وفى مجمع الضّمانات الفصل الخامس فى جناية البهيمة ج:٣ ص:٣ وان أدخل بعيرًا مغتلمًا فى دار رجل وفى الدّار بعير صاحب الدّار فوقع عليه المغتلم اختلفوا فيه قال بعضهم لا يضمن صاحب المغتلم وقال الفقيه أبو اللّيث ان أدخله باذن صاحب الدّار لا يضمن وان أدخله بغير اذنه ضمن وعليه الفتوىٰ لأنّ صاحب المغتلم وان كان مسببا فاذا أدخله باذنه لم يكن متعدّيا وان أدخل بغير اذنه كان متعدّيا فيضمن كمن ألقىٰ حيّة علىٰ انسان فقتلهُ كان ضامنًا.

وفى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الثانى عشر فى جناية البهائم والجناية عليها ج:٦ ص:٥٢ (طبع رشيديه كوئٹه) رجل أدخل بعيرًا مغتلمًا فى دار رجل وفى الدّار بعير صاحبها فوقع عليه المغتلم فقتله اختلف المشائخ رحمهم الله فيه منهم من قال لا ضمان علىٰ صاحب المغتلم وقال بعضهم ان أدخل صاحب المغتلم بغير اذن صاحب الدّار فعليه الضّمان وان كان أدخله بلا اذنه فلا ضمان وبه أخذ الفقيه أبو اللّيث رحمه الله تعالىٰ وعليه الفتوىٰ كذا فى المحيط.

وفى الهندية، كتاب الغصب، الباب الرّابع عشر فى المتفرّقات ج:٥ ص:١٥٢ (طبع رشيديه كوئٹه) وان أدخل فى دار رجل بعيرًا مغتلمًا وفى الدّار بعير صاحب الدّار فوقع عليه المغتلم اختلفوا فيه قال الفقيه أبو اللّيث ان أدخله باذن صاحب الدّار لا يضمن وان أدخله بغير اذنه يضمن وعليه الفتوىٰ .....الخ.

ربط حماره فی سارية فجاء آخر بحماره وربطه، فعضّ أحدهما الآخر وهلک إن فی موضع لهما ولاية الربط لا يضمن، وإلّا ضمن، بأن لم يكن ذلک الموضع طريقا ولا ملكا لأحد لا يضمن اذا كان فی المكان سعة، وفی الطريق يضمن لأن الربط ثمه جناية. (حوالہ مذکورہ[1] و شامی ج:۴ ص:۳۹۲)[2]۔

اور ایسے مواقع پر ایسے قرائن کی بنیاد پر ضمان عائد کیا جاسکتا ہے جن کی موجودگی میں ظنِ غالب قائم ہوجائے، چنانچہ معین الحکام میں ہے: "علی الناظر أن يلحظ الأمارات والعلامات إذا تعارضت، فما ترجح منها قضی بجانب الترجيح وهو قوة التهمة، ولا خلاف فی الحكم بها وقد جاء العمل بها فی مسائل اتفق عليها الطوائف الأربع من الفقهاء." (معين الحكام ص:۲۰۳، باب: ۵۱، فی القضاء بما يظهر من قرائن الأحوال والامارات). هٰذا ما عندی

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷۰/۲۸ ب)

***

---

(۱) البزازية علیٰ هامش الهندية، كتاب الجنايات (الرّابع فی الجناية علیٰ غير بنی آدم ....الخ) ج:۶ ص:۴۰۳ (طبع رشیدیه کوئٹه).

(۲) وفی الشامية، باب جناية البهيمة والجناية عليها قبيل باب جناية المملوک والجناية عليه ج:۶ ص:۲۱۲ (طبع سعيد) ربط حمارهُ فی سارية فربط آخر حماره، فعض حمار الأوّل ان فی موضع لهما ولاية الرّبط لا يضمن والّا ضمن ملخّصًا والله تعالیٰ أعلم.

کتاب الصلح
(صلح کے مسائل کا بیان)

کلیم کے ذریعے حاصل کی گئی جائیداد سے بدلِ صلح لے کر دستبردار ہونے والے کو دوبارہ مطالبے کا اختیار نہیں

سوال:- الف:- محمد اسماعیل ولد حاجی اللہ دیا، ساکن سرگودھا (داماد)

ب:- ملک دین محمد، ساکن کراچی (سسر)۔

ج:- اصل دُکان دار جس سے پگڑی پر ''الف'' نے عارضی طور پر دُکان خریدی۔

''الف'' نے ''ج'' سے تقریباً تین ہزار روپے میں پگڑی پر دُکان خریدی، (تحقیق معلوم نہیں) یہ صرف ''الف'' کی زبانی ہے، یہ سرکاری طور پر بیع نہیں ہوسکتی تھی لیکن ایک شرط پر کہ مہاجر کو متروکہ جائیداد کے بدلے پاکستان کی متروکہ جائیداد مل سکتی ہے، چونکہ ''الف'' کے پاس کوئی جائیداد نہیں تھی، بدیں وجہ ''الف'' نے ''ب'' کی متروکہ جائیداد کا کلیم حاصل کیا، جو کہ پانچ ہزار کا تھا۔ ''ب'' نے اس شرط پر کلیم دیا کہ آدھی دُکان ''الف'' کی ہوگی اور آدھی ''ب'' کی ہوگی، یہ سب زبانی اقرار ہوا جس کو ''الف'' نے بخوشی قبول کیا۔

لیکن سرکاری طور پر یہ دُکان بہ قیمت پانچ ہزار میں مل جانے پر ''الف'' نے بدعہدی کی، اور پانچ ہزار کے کلیم کا آدھا حصہ دینا چاہا، لیکن ''الف'' کے والد کے ڈانٹنے پر کلیم یعنی پانچ ہزار نقد ادا کردیا (بذریعہ اَقساط) چونکہ ''ب'' کی مالی حالت اچھی نہ تھی دُوسرے رشتہ داری کا معاملہ، تیسرے بوجہ مجبوری کلیم کی رقم وصول کرلی، اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا ''ب'' کا آدھا حصہ برقرار ہے (بشرطیکہ پورے خرچ کا آدھا حصہ ادا کردے) یا کہ نہیں؟

کیا ''الف'' اَزرُوئے شرع بدعہدی کا گنہگار ہے یا کہ نہیں؟ اگر ہے تو کیا اپنے آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچنے کے لئے آدھی دُکان دیدے، اس دُکان سے برسوں سے تین سو، چار سو، پانچ سو ماہوار

کرایہ کھا رہا ہے، اب مرتے وقت مسجد کے نام اللہ کے نام پر دُکان دے رہا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- کلیم کے ذریعے حکومت جو جائیداد کسی کو دیتی ہے وہ حکومت کی طرف سے اُس کو عطیۂ ابتدائی ہوتا ہے، اور اُس کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جس کے کلیم پر وہ جائیداد عطا کی گئی، لہٰذا کلیم میں حاصل ہونے والی اس دُکان کا اصل مستحق ''ب'' تھا، لیکن اس نے ''الف'' کو آدھی دُکان دینے کا جو معاہدہ کرلیا، یہ درحقیقت کلیم حاصل کرنے کی اُجرت تھی (جو جعالہ یا سمسرہ کے اُصول پر دُرست ہوسکتی ہے)، لہٰذا ''الف'' پر واجب تھا کہ وہ دُکان کا آدھا حصہ خود رکھے، اور آدھا حصہ ''ب'' کو دے، اُس نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرکے بدعہدی کا گناہ کیا، لیکن جب اس نے پانچ ہزار روپے کی رقم ''ب'' کو دے دی اور ''ب'' نے وہ رقم بغیر کسی اعتراض کے رکھ لی اور اس وقت دُکان کے نصف حصے کا مطالبہ نہیں کیا، تو فقہی اعتبار سے وہ بدلِ صلح لے کر دُکان سے دستبردار ہوگیا،[۱] اب پوری دُکان ''الف'' کی ہوگئی،[۲] ''الف'' کو چاہئے کہ اس نے شروع میں جو بدعہدی کی تھی اُس پر توبہ و اِستغفار کرے، اور ''ب'' سے بھی اس پر معافی مانگے، لیکن بدلِ صلح وصول کرنے کے بعد ''ب'' اس دُکان سے دستبردار ہوچکا ہے، لہٰذا اب دُکان ''الف'' ہی کی ہے،[۳] اب اس پر اس کا نصف حصہ ''ب'' کو دینا واجب نہیں۔[۴]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۰/۲۷ و)

***

(۱ تا ۴) وفی الدّر المختار، کتاب الصُلح ج:۵ ص:۶۲۹ (طبع سعید) وحکمه وقوع البرأة عن الدّعویٰ ووقوع الملک فی مصالح علیه وعنه لو مقرًّا أو هو صحیح مع اقرار أو سکوت أو انکار فالأوّل حکمه کبیع ان وقع عن مال بمال وحینئذٍ فتجری فیه أحکام البیع. وفی الشامیة تحته (قوله کبیع) أی فتجری فیه أحکام البیع فینظر ان وقع علیٰ خلاف جنس المدعی فهو بیع وشراء کما ذکر هنا وان وقع علیٰ جنسه فان کان بأقل من المدعی فهو حط وابراء .... اعتبر بیعًا ان کان علیٰ خلاف الجنس ...... الخ.

﴿کتاب الوکالة﴾
(وکالت کے مسائل کا بیان)

عقدِ وکالت میں مضاربت کے طور پر اُدھار چیز فروخت کرنے اور وکیل سے فوری ثمن کی ادائیگی کا مطالبہ کرنے کا حکم

سوال:- فضیلة القاضی محمد تقی العثمانی المحترم

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

تنوی شرکة تیباستی لتجارة السیّارات شراء سیّارات من شرکة تویوتا الیابانیة بطریقة الدفع المؤجل بعد ۱۸۰ یومًا من تاریخ استلام البضاعة وترغب المضاربة الاسلامیة الدخول فی هٰذه الصفقة حسب الخطوات التالیة:-

۱- تقوم شرکة تویوتا بتعیین المضاربة الإسلامیة وکیلة لها فیما یتعلق بتداول ومعالجة جمیع وثائق إتمام العملیة بما فی ذٰلک سندات الدفع والضمانات والأمور الأخریٰ المتعلقة بها.

۲- تقوم المضاربة الاسلامیة بإبلاغ شرکة تیباستی بأمر تعیین المضاربة وکیلة لتویوتا لهٰذه العملیة وتحصل علیٰ قبولها بذٰلک.

۳- تقوم المضاربة بدفع قیمة السیّارات إلیٰ شرکة تویوتا فور تسلم شرکة تیباستی لهٰذه السیّارات وذٰلک بعد خصم نسبة مئویة من هٰذه القیمة کعمولة للمضاربة بصفتها وکیلة للشرکة البائعة.

۴- تقوم المضاربة بتحصیل کامل قیمة السیّارات لحسابها من شرکة تیباستی بعد ۱۸۰ یومًا من تاریخ استلامهم لهٰذه السیّارات.

أرجو من فضیلتکم التکرم بابداء رأیکم بصحة هٰذه العملیة من الوجهة الشرعیة لیسنی اعتمادها أو تعدیلها بما هو مناسب وذٰلک قبل الشروع بها.

زیاد علی صبری

مدیر برج المؤسسة العربیة المصرفیة المنطقیة المنامة دولة البحرین

جواب :-

الیٰ سیادة الأخ زیاد علی صبری

مدیر المضاربة الاسلامیة فی المؤسسة العربیة

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

استلمت رسالتکم الّتی سئلتم فیها عن شرعیة عقد الوکالة مع شرکة تویوتا ونظرت فی شرط هذا العقد، فتبین لی أن هذا العقد یمکن بطریقتین، أحدهما جائز، والآخر غیر جائز.

الأوّل أن تلتزم المضاربة الاسلامیة فی عقد الوکالة مع شرکة تویوتا (وهی البائعة) أنها ستقوم بدفع الثمن إلیها من قبل شرکة تیباستی (وهی المشتریة) فور استلامها للسیّارات. وباستلام الثمن منها عند حلول أجل ۱۸۰ یومًا فهذا الشرط فی عقد الوکالة شرط فاسد لا یجوز شرعًا، وذلک لأن مقتضی هذا الشرط من قبل الموکل أنه توکیل ببیع السیّارات بثمن مؤجل علیٰ أن یدفع الوکیل الثمن إلی المؤکل حالًا. وهذا مناقض لعقد الوکالة.[۱]

والطریق الثانی: أن لا یشترط ذلک فی عقد الوکالة مع شرکة تویوتا بل توکل شرکة تویوتا المضاربة الاسلامیة ببیع السیارات بیعًا حالًا وتعقد المضاربة الاسلامیة البیع الحال مع شرکة تیباستی، کوکیل عن شرکة تویوتا، ثم تستقرض شرکة تیباستی مبلغ الثمن من المضاربة الاسلامیة بعقد منفصل من عقد البیع، وحینئذ تدفع المضاربة الاسلامیة ثمن السیّارات إلیٰ شرکة تویوتا بعد خصم أجرة الوکالة منه ثم تدفع شرکة تیباستی المبلغ المستقرض من المضاربة بکامله.

وهذا الطریق جائز شرعًا ما دام کلّ من عقد الوکالة وعقد البیع وعقد الاستقراض منفصلًا عن الآخر.[۲] والله سبحانه وتعالیٰ أعلم

۱۴۰۸/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۹۳/۳۹ ح)

✻✻✻

(۱) فی الدر ج:۵ ص:۵۲۲ (طبع سعید) وصح بالنسیئة ان التوکیل بالبیع للتجارة وان کان للحاجة لا یجوز ...... لکنه لا یطالب الا بعد الأجل کما فی تنویر الأبصار.

(۲) فی مسند أحمد بن حنبلؒ رقم:۳۷۸۳ ج:۳ ص:۳۰ (طبع دار الحدیث القاهرة) نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن صفقتین فی صفقة واحدة. نیز دیکھئے ص:۷۸ کا حاشیہ نمبر۱ وص:۵۷ کا حاشیہ نمبر۱و۲۔

﴿کتاب القسمۃ﴾

(تقسیم کے مسائل کا بیان)

چار بھائیوں کے درمیان زمین کی تقسیم پر تنازعے کا حل

سوال:- حاجی علی محمد صاحب ۱۹۴۸ء میں فوت ہوئے، ان کے چار بیٹے محمد علی، محمد شریف، محمد عارف اور انور علی تھے، ۱۹۲ ایکڑ رقبہ بذریعہ ثالثان چار حصوں میں برابر تقسیم کر کے قرعہ اندازی سے خانگی تقسیم کی گئی، محکمہ مال میں مشترکہ کھاتہ رہا، محمد علی اپنے قرعے کے مطابق اپنے حصے کا رقبہ لے کر جدا ہوگیا، باقی تین بھائی دو سال اکٹھے رہنے کے بعد ان میں سے ایک بھائی محمد عارف بھی قرعہ والا رقبہ لے کر جدا ہوگیا، رقبے میں کوئی فرق تاحال نہ آیا تھا، اس کے بعد پتہ چلا کہ محمد شریف کے حصے والے رقبے میں ۱۱۵ ایکڑ کا پانی نہیں ہے جو کہ بارانی قسم کا ہے، باقی تین بھائیوں کے حصے میں تمام نہری قسم کا رقبہ ہے، محمد شریف نے پنچایت کی کہ بارانی قسم والا رقبہ حصہ رسدی تقسیم ہونا چاہئے جو کہ لاعلمی کی وجہ سے اکیلے محمد شریف کے حصے میں ان کی قدر رقبہ یعنی بارانی قسم کا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ تین بھائیوں کے حصے میں پندرہ پندرہ ایکڑوں میں کہیں کہیں کلر والا رقبہ تھا، محمد شریف کے حصے میں (پندرہ ایکڑ میں) بھی کہیں کہیں ٹیلہ تھا، پنچایت نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ تقسیم کرلی جائے، لیکن دو بھائی محمد علی اور محمد عارف نے کہا کہ اب ہم دوبارہ تقسیم نہیں کرتے، اور نہ ہی خرچہ ان کی مد کا ادا کرتے ہیں، لہٰذا محمد شریف اور انور علی دو بھائی اکٹھے رہ رہے تھے اور ان کے قبضے کے رقبات بھی اکٹھے تھے، ان دونوں نے مل کر محکمہ انہار میں دعویٰ کردیا، دونوں بھائیوں نے اپنے خرچے سے ان ٹیلوں کو آباد کیا، محکمہ انہار میں ۱۵ سال دعویٰ دائر رہا، فیصلہ ہوا کہ بارانی قسم کی بری قسم میں منظور کیا جاتا ہے۔ دونوں بھائی اتفاق و محبت سے کئی سال تک اکٹھے رہے اب جھگڑا پڑ گیا ہے، محمد شریف کہتا ہے کہ میں وہی رقبہ جو کہ آج سے پچیس سال پہلے میرا حصہ تھا وہی لے کر جدا ہوں گا، انور علی کہتا ہے کہ ہم دونوں بھائیوں والا حصہ ازسرِنو تقسیم ہو، کیونکہ رقبے میں کافی فرق آچکا ہے، محمد شریف کے سوا تمام ۲۳ ایکڑ اراضی اچھی حالت میں ہیں، انور علی کے پندرہ ایکڑ کلر ہوچکے ہیں، شرعاً کیا فیصلہ ہے کہ چاروں بھائی ازسرِنو تقسیم کریں یا صرف ہم شریف اور انور علی کی زمین ہی ازسرِنو تقسیم ہو، یا بالکل نہ ہو؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں محمد شریف اور انور علی کو صرف اپنے اپنے حصوں کی تقسیم ازسرِنو کرنی چاہئے، دراصل جب چاروں بھائیوں کے درمیان زمین تقسیم ہوئی اُس وقت یہ غلطی رہ گئی کہ

لاعلمی کی وجہ سے ایک حصے میں پندرہ ایکڑ رقبہ بارانی آگیا، جبکہ باقی تمام حصوں میں رقبہ نہری تھا، اُس وقت محمد شریف نے تقسیم پر جو اِعتراض کیا وہ دُرست تھا، اور چاروں بھائیوں کو چاہئے تھا کہ تقسیم ازسرِنو کرتے (کما یفهم من العبارة الأولیٰ)۔ لیکن جب دُوسرے بھائیوں نے ازسرِنو تقسیم کرنے سے انکار کیا تو محمد شریف زمین کو نہری قرار دینے کی درخواست دے کر اور انور علی کے ساتھ شرکت کر کے عملاً دوبارہ تقسیم کے حق سے دستبردار ہوگیا، اب انور علی کے ساتھ شرکت قائم کرنے سے ان دونوں کے درمیان جو تقسیم ہوئی تھی وہ فسخ ہوگئی، اور محمد شریف اور انور علی کے حصوں کی زمین ان دونوں کے درمیان پھر سے مشترک ہوگئی، (کما یفهم من العبارة الثانیة)۔ اب جبکہ یہ دونوں الگ ہونا چاہتے ہیں انہیں ازسرِنو تقسیم کر کے الگ ہونا چاہئے، اس سلسلے میں عباراتِ فقہیہ درج ذیل ہیں:۔

العبارة الأُولیٰ:- "اذا اقتسما دارًا فلما وقعت الحدود بینهما اذا أحدهما لا طریق له فإن كان يقدر علىٰ أن يفتح لنصيبه في حيزه طريقًا آخر فالقسمة جائزة وإن كان لا يقدر علىٰ أن يفتح لنصيبه طريقًا إن علم وقت القسمة أن لا طريق له فالقسمة جائزةٌ وان لم يعلم فالقسمة فاسدة." (عالمگیریة ج:۵ ص:۲۱۱، کتاب القسمة، باب:۳)۔ (۱)

العبارة الثانیة:- "القسمة تقبل النقض، فلو اقتسموا وأخذوا حصتهم ثم تراضوا علی الاشتراک بینهم صح) وعادت الشركة في عقار أو غيره لأن قسمة التراضي مبادلة ويصح فسخها ومبادلتها بالتراضي" (درمختار مع شامی ج:۵ ص:۱۷۰، کتاب القسمة)۔ (۲)

هذا ما ظهر لي

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۲۳/۲۷ و)

---

(۱) وفي الهداية ج:۴ ص:۴۱۷، کتاب القسمة (طبع شرکت علمیہ)۔

وفي البحر الرائق، کتاب القسمة (طلب بعض الشركاء القسمة) ج:۸ ص:۱۵۳ (طبع سعید) ولو اقسموا دارًا فاذا لا طريق لأحدهم وقدر علىٰ أن يفتح في نصيبه طريقًا يمرّ فيه الرّجل دون الحمولة جازت القسمة لأنها لم تتضمن تفويت منفعة وان لم يقدر ينظر ان لم يعلم أنّه لا طريق لهٗ فالقسمة فاسدة وان علم انه لا طريق لهٗ جازت القسمة لأنّه رضي بهذه القسمة.

وفي المحيط البُرهاني، کتاب القسمة، فصل في بيان ما يقسم وما لا يقسم ...الخ ج:۱۱ ص:۱۵۰ (طبع ادارة القرآن) واذا اقتسم الرّجلان دارًا فلمّا وقعت الحدود بينهما فاذا أحدهما لا طريق لهٗ فان كان يقدر علىٰ أن يفتح في حيَزه طريقًا في القسم جائز وان كان لا يقدر أن يفتح لنصيبه طريقًا فان لم يعلم وقت القسم أن لا طريق لهٗ فالقسمة فاسدة لأنها تضمنت تفويت منفعة علىٰ بعض الشركاء بغير رضاهٗ وان علم وقت القسمة أن لا طريق لهٗ فالقسمة جائزة ......الخ.

(۲) الدّر المختار ج:۶ ص:۲۶۸ (طبع سعید)

وفي بدائع الصنائع، کتاب القسمة، فصل وامّا صفات القسمة ....الخ ج:۷ ص:۲۸ (طبع سعید)

وأمّا في قسمة التراضي فيجوز الرّجوع لأنّ قسمة التّراضي لا تتمّ الّا بعد خروج السهام كلّها وكل عاقد بسبيل من الرّجوع عن العقد قبل تمامه كما في البيع نحوه.

وفيه أيضا ج:۷ ص:۲۶ (طبع سعید) ان قسمة الجمع في الدّور بالتّراضي جائزة بلا خلاف ومعنى المبادلة وان كان لازمًا في نوعي القسمة لكن هذا النوع بالمبادلات أشبهٗ واذا تحققت المبادلة صح البناء .....الخ.

تبصرے

متعدد کتابوں پر تحریر کیے گئے تبصروں کا مجموعہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

ترتیب

مولانا محمد حنیف خالد

استاذ جامعہ دار العلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴